2
مئی 2017 / شعبان المعظم ۱۴۳۸ھ

خدا پرستی، انسان دوستی، معاشی انصاف



بیاد: حضرت مولانا قاری ثناء اللہ رحمۃ اللہ علیہ

بدعا: حضرت مولانا نعیم الدین صاحب مدظلہم

ملنے کے پتے

صفہ ٹرسٹ
موہنی روڈ لاہور

دار القرآن والترتیل
14- لٹن روڈ مزنگ لاہور

مکتبہ قاسمیہ
الفضل مارکیٹ اردو بازار لاہور

دار العلوم حسینیہ
صوفیہ آباد لاہور

مکتبہ الحسن
اردو بازار لاہور

قاری خالد محمود
کیپٹن جمال روڈ سانده کلاں

اقرأ کمپنی
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

دار الکتاب
غزنی اسٹریٹ اردو بازار لاہور

رابطے کے لیے
0333-4432853, 03310070580
email:safhat2016@gmail.com
facebook.com/safhat2016
مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان، 3-محمود سٹریٹ، موہنی روڈ لاہور۔

سطریں

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ اَمَّا بَعْدُ!

بعد الحمد والصلوۃ ......دین کے پانچ شعبے ہیں: عقائد: یہ علم کا موضوع ہے، اس کو سڑکوں پر نہیں لایا جانا چاہیے۔ عبادات: یہ دعوت کا موضوع ہے۔ اخلاق: یہ تربیت کا موضوع ہے، خانقاہوں میں یہ کام ہوتا ہے یا ہونا چاہیے۔ معاملات: یہ تربیت اور قانون دونوں کا موضوع ہے۔ قانون (شریعہ): اجتماعی عدل (معاشی، معاشرتی) کا قیام یہ سیاست کا موضوع ہے، اس کے لیے سیاسی جدو جہد ہے۔ جمعیت علماء کے اغراض ومقاصد کا پہلا نکتہ ہے: اقامت دین اور اشاعت اسلام، اقامت دین اجتماعی عدل کے قیام کی سیاسی کوشش ہے، اشاعت اسلام سماج میں دینی محنت کا نام ہے، کسی ایک کو بھی نظر انداز کرنے سے مراد حاصل نہیں ہوگی۔ جمعیت علماء کے اکابران دونوں میدانوں میں کام کرتے رہے اور اپنے متبعین لیے بھی اسی راہ کی تعیین کی ہے، قاری محمد طیب صاحب رح اپنے خطبہ "دین وسیاست" میں فرماتے ہیں کہ سیاست، دین کے بغیر فرعونیت ہے اور دین، سیاست کے بغیر مذاق ہے۔ اعلای کلمۃ اللہ کے کام کو سمجھنے کے لیے اور جماعتی ساتھیوں کی تربیت کے لیے اس خطبہ کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ جمعیت علماء کی سوسالہ جدوجہد کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ اکابر جمعیت علماء نے حقیقت کو کبھی بھی، رومانویت کی بھینٹ نہیں چڑھایا بلکہ موجود اور میسر مواقع کی تاثیری درجہ بندی کر کے اپنی فکر کی عملی صورت گری کی ہے اور اپنے کارکن کو عملیت کا درس دیا ہے۔ رومانویت کے دو خطرناک اثرات ہیں: ایک مایوسی اور دوسرا ہیجان، پہلے کا نتیجہ بے عملی اور دوسرا سماج میں فساد پھیلانے کا سبب ہے، جمعیت علماء نے اپنے متبعین کو ان سے ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔

"اکابر جمعیت علماء نے بہت سی سیاسی آرا پیش کیں مگر انھوں نے ہمیشہ نص اور اپنی آرا میں فرق رکھا، نص میں کسی ترمیم کو برداشت نہ کیا اور ذاتی رائے کو نص کا درجہ نہیں دیا۔ انھوں نے سیاست کو دین کے فروغ کا ذریعہ بنایا یہی وجہ ہے کہ ان کی سرگرمیوں کا محور ومرکز مسجد، مدرسہ اور خانقاہ ہی رہے۔ ان کی سیاست ان مراکز کو مضبوط بنانے کا ذریعہ رہی ہے"۔

پاکستان میں سامراجی اور سرمایہ پرست طاقتوں کے زیر اثر، غیر جمہوری انداز فکر، فرقہ واریت، سیاست بیزار مذہبیت، مغالطوں اور مبالغوں سے آلودہ ذہنیت، شدت پسندی کو فروغ دیا گیا۔ جبکہ جمعیت علماء اپنی تاسیس سے عدم تشدد، خدا پرستی، انسان دوستی، معاشی انصاف، سماجی عدل، جمہوریت، سامراج دشمنی میں واضح اور غیر مبہم رہی ہے۔ جمعیت علماء اسی سوچ اور فکر کے ساتھ پاکستان میں برسر پیکار ہے، ریاست میں مسلح جدوجہد ناجائز، خودکش حملے حرام، دہشت گردی کی مزاحمت، فرقہ واریت کی نفی، ملک میں اسلامی اقدار کے احیا اور اسلامی احکام کی تحکیم وتنفیذ کی پرامن جدوجہد جمعیت علماء کا امتیاز ہے۔

جمعیت علماء اسلام کے زیر اہتمام، اپریل میں جمعیت علماء کا صد سالہ اجتماع منعقد کیا گیا، جو چند وجوہات کی بنا پر ایک تاریخ ساز اجتماع کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ غیر معمولی عوامی شرکت کے علاوہ، اس اجتماع کا فکری پہلو بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے، تمام مکتبہ ہائے فکر کی نمائندگی، دیگر مذاہب کے اکابر کی شرکت، قائد جمعیت، مولانا شیرانی، مولانا محمود مدنی، مولانا گل نصیب خان اور دیگر کے بیانات، رواداری، امن، محبت، انسانیت، عالمگیری اور اعلای کلمۃ اللہ کی پرامن سیاسی جدوجہد کا پیغام دینے کے ساتھ ساتھ سوسالہ تسلسل کو برقرار رکھنے کا عزم اور ہر معاملے میں اعتدال کی راہ اپنانے کا پتا دیتے ہیں۔ اب ہم سب نے اپنی ذمہ داری نبھانی ہے۔

ہم اس کوچے سے نسبت کی خوشی سنبھالیں کیسے
ہمارا نام بھی اس کے خاروخس میں آ گیا ہے

مئی 2017

محمد عرفان شجاع

جمعیت علماء کے سو سال صد سالہ اجتماع کے تناظر میں

حضرت مولانا نعیم الدین صاحب دامت فیوضھم، استاد الحدیث جامعہ مدنیہ کریم پارک لاہور

تقریباً ساڑھے آٹھ سو سال برصغیر پاک و ہند کے مختلف حصوں یا پورے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت رہی، یہ تو حتمی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ مسلمانوں کی حکومت مکمل طور پر اسلامی طرز پر تھی مگر اتنی بات طے ہے کہ مسلمان حکمرانوں کو اُس دور میں اسلامی احکام اپنی قوت و اختیار سے نافذ کرنے اور جاری کرنے کی پوری طاقت حاصل تھی اور تمام تر عدالتی فیصلے فقہ حنفی کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کے مطابق ہوتے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزی استعمار کے ہندوستان میں پنجے گاڑنے کے بعد اسلامی شان و شوکت، اسلامی تہذیب و تمدن اور شخصی آزادی سلب ہونے لگی تو آزادیِ وطن اور اسلامی تہذیب و تمدن اور شان و شوکت کو بحال کرنے کی چار مرتبہ منظم جدوجہد کی گئی :

(۱) حضرت سیّد احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کی زیر قیادت پہلی کوشش کی گئی جو اِن حضرات کی بالاکوٹ کے مقام پر شہادت (۲۴/ذوالقعدہ ۱۲۴۶ھ/مئی ۱۸۳۱ء) پر ختم ہوئی۔

(۲) دوسری تحریک ۱۸۵۷ء کی تحریکِ آزادی ہے اس تحریک میں اکابر علماءِ دیوبند سیّد الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت حافظ ضامن شہیدؒ بنفسِ نفیس شریک رہے، بعض مخالفین کے پروپیگنڈہ کے باعث اسے ''غدر'' کہا جاتا ہے حالانکہ یہ تحریک ''تحریکِ آزادی'' تھی۔

(۳) تیسری تحریک علماءِ صادق پور کی زیر قیادت عرصہ دراز تک جاری رہی اور ۱۸۸۲ء کے مشہور مقدمہ انبالہ پر ختم ہوئی۔

(۴) چوتھی تحریک شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کے زیر قیادت تھی جو ''تحریکِ شیخ الہندؒ'' یا ''تحریکِ ریشمی رومال'' کے نام سے مشہور ہوئی، اس تحریک نے ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ کی ہدایت کے بموجب مقامی حریت پسندوں کے بلاتفریقِ مذہب و ملت اتحاد و اشتراک کے ذریعہ سے ''حصولِ آزادیِ وطن کی جدوجہد'' کی شکل اختیار کر لی اور عدمِ تشدد کا راستہ اپناتے ہوئے سیاسی میدان میں انگریز سامراج سے مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

آج سے سو سال قبل ۲۸/صفر المظفر ۱۳۳۸ھ/ ۲۲/نومبر ۱۹۱۹ء دہلی میں ''خلافت کانفرنس'' منعقد ہوئی، خلافت کانفرنس کے بعد پچیس علماء اکٹھے ہوئے اور ۳۰/صفر المظفر ۱۳۳۸ھ/ ۲۴/نومبر ۱۹۱۹ء کو ''جمعیۃ علماءِ ہند'' کا قیام عمل میں آیا، مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اس کے پہلے صدر منتخب ہوئے، امرتسر میں ۲۸/دسمبر ۱۹۱۹ء تا یکم جنوری ۱۹۲۰ء اس کا جلاسِ عام منعقد ہوا۔

۸/جون ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ مالٹا کی قید سے رہا ہو کر واپس ہندوستان پہنچے۔ چند ماہ بعد جمعیۃ علماءِ ہند کا دوسرا اجلاسِ عام ۱۹، ۲۰، ۲۱/نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا، آپ جامعہ ملیہ علی گڑھ بھی تشریف لے گئے اور اپنے خطبۂ صدارت میں زرّیں ہدایات دیں جس کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ علماء کے قریب ہوا اور بہت ساری غلط فہمیاں دُور ہوئیں، آپ نے مدرسوں اور حجروں میں بیٹھے ہوئے گوشہ نشین علماء کو عوام کی رہنمائی کے لیے باہر نکلنے کی ترغیب دی، بدقسمتی سے ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ دہلی میں اس دارِ فانی سے رحلت فرما گئے آپ کے انتقال کے بعد حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ جمعیۃ علماءِ ہند کے صدر بنائے گئے، ۱۹۳۹ء میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا نام صدارت کے لیے منتخب ہوا۔ ہر دو حضرات کے ساتھ علماء و عوام ک کثیر تعداد نے ساتھ دیا اور آزادی وطن کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی، اس کے لیے شب و روز ایک کر دیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں پرائیوں کے ساتھ ساتھ اپنوں کے بھی ظلم و ستم سہے لیکن جمعیۃ علماء کا نظریہ منظم انداز سے آگے بڑھاتے رہے اور زمینی حقائق کو ملحوظ رکھتے ہوئے کامل دیانت داری اور پُرخلوص وفاداری سے ہر ہر قدم پر اور ہر ہر مشکل وقت میں فیصلے کیے جس پر تاریخ شاہد ہے عیاں راچہ بیاں !

تقسیمِ برصغیر اور قیامِ پاکستان کے حوالے سے علماء میں سیاسی اختلاف پیدا ہوا جس کے نتیجہ میں ۲۶، ۲۷، ۲۸، اور ۲۹/اکتوبر ۱۹۴۵ء کو کلکتہ میں بعض علماء کا اجلاس بلایا گیا اور وہاں ''جمعیۃ علماءِ اسلام'' کی بنیاد رکھی گئی اس موقع پر حضرت علامہ شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ موجود نہ تھے تاہم انہیں اس جمعیۃ علماء کا صدر منتخب کیا گیا اور یہ جمعیۃ علماء ''قیامِ پاکستان'' کی تحریک میں عملاً شامل رہی، مسلم لیگ کے ساتھ ایک علیحدہ آزاد اسلامی وطن کے حصول کے لیے کوششیں تیز کر دیں جس کے نتیجہ میں وطنِ عزیز ''پاکستان'' حاصل ہوا۔

اس نوزائیدہ مملکت میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت اُمورِ مملکت چلائے جا رہے تھے لیکن اسلام کے نام پر قائم اس ملک میں اسلامی دستور کی ضرورت سب سے اہم کام تھا، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ نے اس طرف توجہ فرمائی اور مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (انڈیا)، ڈاکٹر حمید اللہؒ (پیرس) اور محترم عبدالوحید (حیدر آباد) کی رفاقت میں اسلامی دستور کے بنیادی اصول مرتب کیے اور ان اصول کو اسمبلی سے منظور کروانے کی جدوجہد میں مصروف رہے اور ۱۲/مارچ ۱۹۴۹ء کو یہ تاریخی تجویز ''قراردادِ مقاصد'' کے نام سے اسمبلی سے منظور کروالی، بعد ازاں علماءِ کرام کی کوششوں سے ۱۹۵۱ء میں تمام معروف مکاتبِ فکر کے نمائندہ اکتیس علماءِ کرام پر مشتمل ایک وفد نے اسلامی دستور کے خاکہ کے طور پر بائیس نکات کو متفقہ طور پر مرتب کر کے حکومتِ پاکستان کو پیش کیا پھر کچھ ہی عرصہ بعد ۱۹۵۳ء کی ''تحریکِ ختمِ نبوت'' چلی، اس تحریک میں ایک ہزار مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا اور دس ہزار سے زائد مسلمان قید و بند کی صعوبتوں سے گزرے، تحریک کے خاتمہ کے بعد ملک کا سیاسی نقشہ بدل گیا، بزرگانِ دین گوشۂ عافیت میں چلے گئے اور درس و تدریس میں مشغول ہو گئے اور وطنِ عزیز میں دینی قیادت کا خلا پیدا ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے غیبی نظام کچھ یوں مہیا فرمایا جسے یادگارِ اسلاف مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ (بھکر) نے اس طرح محفوظ فرمایا، مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ تحریر فرماتے ہیں ''۱۹۵۵ء کے اَواخر یا ۱۹۵۶ء کے اَوائل کی بات ہے حضرت مولانا محمد عبداللہ صاحبؒ (خانقاہِ سراجیہ) نے حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزارویؒ کو اچانک اُن کے وطن سے بلایا اور سیاست کے میدان میں کام کرنے کی ضرورت بیان فرمائی اور اِس کے لیے عملی شکل اختیار کرنے کا ارشاد فرمایا، تقریباً یہی دن تھے کہ حضرت مولانا سیّد امیر حسین شاہ صاحب گیلانی مدظلہم العالی بانی و مہتمم جامعہ مدنیہ اوکاڑہ ہندوستان گئے ہوئے تھے تین چار مہینے دیوبند میں رہے تھے حضرت مدنیؒ سے واپسی کے لیے رخصت ہونے لگے تو حضرتؒ نے دریافت فرمایا کہ وہاں علماء کا کیا حال ہے ؟ شاہ صاحبؒ نے عرض کیا کہ حضرت ! علماء تحریک ۱۹۵۳ء میں پس گئے ہیں اُن میں اُٹھنے کی سکت نہیں رہی، حضرتؒ نے فرمایا : '' اُٹھیں گے نہیں تو ختم ہو جائیں گے اُنہیں کہو کہ اُٹھیں کام کریں ''ان دونوں بزرگوں کے اِس توارد اور فرمان کے نتیجے میں اکتوبر ۱۹۵۶ء میں ملتان میں علماء کنونشن ہوا، جمعیۃ علماء اسلام کی تنظیمِ نو ہوئی، حضرت شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کی امارت اور حضرت مولانا غلام غوث صاحب ہزارویؒ کی نظامت میں کام کا آغاز ہوا۔'' (شیخ الاسلام حضرت مدنیؒ کا مختصر تذکرہ ص ۹۱، ۹۲)

حضرت اقدس مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو روزِ اوّل سے ہی پاکستان میں جمعیۃ کے صفِ اوّل کے اکابر میں سے ایک ہیں، آپ ایک جگہ جمعیۃ کی ''احیائی تاریخ'' کے بارے میں خود تحریر فرماتے ہیں کہ ''حضرت مفتی صاحبؒ کا تعلق اکابر جمعیۃ علماءِ ہند سے تھا وہ سب حضرات مذکورہ بالا اوصاف کے حامل تھے، قیامِ پاکستان کے بعد اِس جماعت سے تعلق رکھنے والے بزرگ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ مغربی پاکستان کے قلب لاہور میں تشریف فرما تھے، مولانا محمد نعیم صاحب لدھیانوی، مولانا

عبدالحنان صاحب ہزاروی اسی جمعیۃ کے پرانے ارکان وعہدہ داران رہ چکے تھے، حضرت مولانا مفتی محمود صاحب نے ان سب حضرات کو ملتان میں جمع کیا ان کے ساتھ پورے ملک کے چیدہ چیدہ علماء کو بھی مدعو کیا، اراکین جمعیۃ علماءِ اسلام (جن کے قائد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ رہ چکے تھے) کو بھی مدعو کیا، یہ ۱۹۵۶ء کی بات ہے میں خود بھی اس میں شریک تھا یہ اجلاس حاجی یاران خاں کی زیر تکمیل کوٹھی میں ہوا، حضرت مولانا احمد علی صاحب کو امیر منتخب کیا گیا اور دیگر عہدہ داران کا بھی انتخاب ہوا، اجلاس میں شریک مولانا غلام غوث صاحب کو ناظم منتخب کیا گیا۔ یہ سب کارروائی مولانا مفتی محمود صاحبؒ نے کی تھی جو وقت اور ضرورت کے عین مطابق تھی، کام کرنے والے سب علماء مجتمع ہو گئے اور جمعیۃ کا احیاء ہو گیا خداوند کریم نے مفتی صاحبؒ کی اس کوشش کو بار آور فرمایا، علماء ان حضرات کی سرکردگی میں دینی اور سیاسی خدمات انجام دیتے رہے'' (ماہنامہ انوارِ مدینہ جولائی ۲۰۱۲ء ص ۱۷و ۱۸)

اس کے بعد تسلسل سے جمعیۃ علماءِ اسلام کے قائدین کی قیادت میں وطنِ عزیز میں دینِ اسلام کے تحفظ اور بقا کے حوالہ سے بے شمار خدمات انجام دی گئیں جن کا احاطہ ان چند سطور میں مشکل ہے بطورِ نمونہ مشتے از خروارے چند اُمور ملاحظہ فرمائیں :

(۱) ۲۹ فروری ۱۹۵۶ء کو پاکستان کا پہلا آئین منظور ہوا جو ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ ہوا، اس دستور کا جمعیۃ علماءِ اسلام نے تنقیدی جائزہ لیا، تنقیدات اور ترامیم مرتب کر کے حکومت کو پیش کیں۔

(۲) ۱۹۶۲ء میں صدر ایوب خان کے دورِ حکومت میں ''عائلی قوانین'' کے نام پر خلاف اسلام قانون کی منظوری دی گئی تو جمعیۃ علماء کے ممبرانِ اسمبلی نے اسمبلی میں اور اسمبلی سے باہر جمعیۃ علماء کے بزرگوں نے صدائے حق بلند کی اور ان قوانین کو چیلنج کیا۔

(۳) مئی ۱۹۷۰ء میں جمعیۃ علماءِ اسلام کی دعوت پر حضرت مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی زیر قیادت لاہور میں اُنیس دینی جماعتوں کا ''متحدہ دینی محاذ'' قائم ہوا، اس اتحاد کی وجہ سے کئی علماء دسمبر ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں اسمبلی میں پہنچے۔

(۴) یکم مئی ۱۹۷۲ء کو حضرت مفتی محمود صاحبؒ اُس وقت صوبہ سرحد اور موجودہ خیبر پختونخوا کے وزیر اعلیٰ بنے، آپ نے اپنے وزارت علیا کے دور میں مرکزی حکومت کی جانب سے رُکاوٹوں کے باوجود تاریخی کارنامے انجام دیے مثلاً اپنے صوبہ میں شراب سودی لین دین اور جوئے پر مکمل پابندی، جہیز پر ایک حد کی تقرری، جمعہ کے دن سرکاری تعطیل، صوبہ سرحد کی سرکاری زبان اُردو، احترام رمضان میں تمام ہوٹلز بند، شلوار قمیض سرکاری لباس مقرر، کالجز اور یونیورسٹیز میں داخلہ کے لیے قرآنِ پاک کی لازمی تعلیم وغیرہ۔

(۵) ۱۹۷۳ء میں ایک نئے آئین کی تیاری شروع ہوئی تو جمعیۃ علماء کے قائدین نے اسلامی قوانین کے لیے آواز بلند کی اور آئین کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا، اس طرح پہلی بار اسلامی دفعات ملک کے آئین کا حصہ بنیں اور ۱۹۷۳ء کا یہ آئین اسلام کے سنہری اصولوں پر بنایا گیا اور جمعیۃ علماء اور دیگر مذہبی سیاسی جمعتوں کی کوششوں سے متفقہ طور پر منظور کیا گیا، بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۵۶ء کے آئین سے لے کر ۱۹۷۳ء کے آئین کی منظوری تک کوئی بھی ایسی اسلامی شق نہیں ہے جو جمعیۃ علماءِ اسلام کی کوششوں کے بغیر آئین کا حصہ بنی ہو۔

(۶) ۱۰ اپریل ۱۹۷۳ء کو یہ آئین اسمبلی سے منظور ہوا اور اس آئین نے ملک میں کسی بھی غیر اسلامی قانون یا شق کے راستے بند کر دیے، حقیقت تو یہ ہے کہ اس آئین نے مسئلہ ختم نبوت کے محاذ پر بھی قانونی بنیاد فراہم کی۔

(۷) مئی ۱۹۷۴ء میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی قیادت میں تحریکِ ختم نبوت چلی تو اسمبلی میں مسئلہ ختم نبوت کے لیے آواز اُٹھانے والوں میں قائد جمعیۃ حضرت مفتی محمود صاحبؒ کا نام سرفہرست ہے، مفتی محمود صاحبؒ نے گیارہ دن لگاتار مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوتِ نبوت پر جرح کی اور مرزا ناصر کے استدلالات کے جوابات دیے بالآخر ۷ ستمبر ۱۹۷۴ء کو مرزا قادیانی اور اُس کے پیروکاروں کو آئین پاکستان کی رُو سے غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔

(۸) جولائی ۱۹۷۷ء میں جب ضیائی آمریت نے شب خون مارا تو اس کے بعد بحالی جمہوریت کے لیے اوّلاً مفتی محمود صاحبؒ اور آپ کے انتقال (۱۴ اکتوبر ۱۹۸۰ء) کے بعد آپ کے فرزند ارجمند حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم نے آپ کے مشن پر عمل پیرا ہوتے ہوئے بحالی جمہوریت کی جدوجہد کے تسلسل کو برقرار رکھا اور مارشل لاء کے خلاف اس تحریک میں وقتاً فوقتاً تقریباً ساڑھے چار سال قید و بند کی صعوبت برداشت کی۔

(۹) ضیائی آمریت کے دور میں ایم آر ڈی کی تشکیل بھی جمعیۃ علماءِ اسلام کا زریں کارنامہ ہے، یہ وہ دور ہے جس میں جمعیۃ علماء کا نام لینا اور اس سے وابستہ رہنا کارِ دُشوار تھا اس پُر آشوب دور میں بانی جامعہ حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو جمعیۃ علماءِ اسلام کا امیر منتخب کیا گیا آپ تا حیات اس منصب پر فائز رہے، اللہ جزائے خیر دے حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ کو کہ اِس کڑے اور مشکل دور میں آپ نے جہاں جمعیۃ کی بے مثال قیادت کی وہیں آپ نے مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم کے سر پر دستِ شفقت رکھا، جمعیۃ علماءِ اسلام کا مرکزی دفتر جامعہ مدنیہ میں بنوایا جو آج بھی قائم ہے، حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم فرماتے ہیں : ''جب مولانا حامد میاں صاحبؒ کے پاس یہاں (جامعہ مدنیہ) حاضری دیتا تھا وہ مجھے فرماتے تھے کہ بھئی آپ کا مدرسہ یہ ہے آپ یہاں ٹھہرا کریں اور محمود بھائی (مولانا سید محمود میاں) بھی مجھے بڑی معصومیت سے کہتے تھے کہ آپ یہاں رہا کریں، اُس وقت مجھے اس رشتہ اور اس تعلق کی گہرائی کا اندازہ نہیں تھا اور مجھے علم نہیں تھا کہ مولانا حامد میاںؒ مجھے جس مدرسہ کے بارے میں کہتے تھے یہ آپ کا گھر ہے یہ آپ کا مدرسہ ہے آپ یہاں رہیں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا مسکن بن جائے گا پوری جماعت کا مسکن بن جائے گا مرکز بن جائے گا'' مزید فرماتے ہیں ''میں سمجھتا ہوں یہ وہ دن تھے جب جمعیۃ علماءِ اسلام کو بچانے کی ضرورت تھی اور جب ہمارے لیے کسی مدرسہ اور مسجد میں قدم رکھنا مشکل تھا تو حضرت مولاناؒ نے جامعہ مدنیہ کو جمعیۃ علماءِ اسلام کے لیے قدم گاہ بنایا۔ ہے'' (ماہنامہ انوار مدینہ جلد ۱۳، شمارہ ۹، ص ۱۷و ۱۸)

حضرت مولانا سیّد حامد میاں صاحبؒ نے حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم کی سیاسی تربیت بھی کی اور ساتھ ساتھ آپ جماعتی اُمور پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اس حوالہ سے مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم فرماتے ہیں ''لیکن کبھی کبھی ہم سوچتے تھے کہ حضرت تو گھر بیٹھنے والے آدمی ہیں اور ہم اپنے انداز سے کبھی بے باکی بھی کرتے تھے لیکن جب میں حاضر ہوتا تو جس انداز سے وہ میرا احتساب لیتے تھے تنہائی میں تو وہ پھر مجھے معلوم ہے کہ کیا گزرتی تھی، ساتھی کہتے ہیں کہ وہ غصہ نہیں کرتے تھے مجھ سے پوچھو کہ وہ غصہ کرتے تھے اور کس طرح وہ گرفت کرتے تھے غلطیوں پر اور کس طرح وہ پھر نئی ہدایات دیتے تھے بہر حال ضیائی مارشل لاء کے دور میں جمعیۃ علماءِ اسلام نے تحریک بحالی جمہوریت (ایم آر ڈی) کے دوران بے مثال جدوجہد جاری رکھی۔

(۱۰) ۱۹۸۸ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماءِ اسلام کو دو سو سات ارکانِ ایوان میں سے صرف آٹھ افراد کی سیاسی قوت حاصل تھی اور جمعیۃ علماءِ اسلام اپوزیشن میں شامل تھی، ۱۹۹۰ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماءِ اسلام چھ نشستوں پر کامیاب تھی، ۱۹۹۳ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماءِ اسلام کو چار نشستوں پر کامیابی حاصل تھی اس موقع پر نواز شریف صاحب کے سابقہ رویوں بالخصوص سود کو تحفظ فراہم کرنے کی وجہ سے جمعیۃ علماءِ اسلام نے مسلم لیگ کو وزارت عظمیٰ کا ووٹ دینے سے انکار کر دیا اور پیپلز پارٹی کو بھی ووٹ نہیں دیا بلکہ وزارتِ عظمیٰ کا ووٹ کاسٹ ہی نہیں کیا، یہ ایک بہت بڑی تاریخی یادگار ہے۔ ۱۹۹۷ء کے انتخابات میں بھی جمعیۃ علماءِ اسلام کے ارکان پارلیمنٹ میں پہنچے، ۱۹۹۹ء میں جنرل پرویز مشرف کے ہاتھوں مسلم لیگ (ن) کی حکومت کے خاتمہ کے بعد ۲۰۰۱ء میں بلدیاتی انتخابات اور ۲۰۰۲ء میں عام انتخابات کے نتیجہ میں صوبہ سرحد میں ایم ایم اے کی حکومت بنی اُس صوبائی حکومت کے نمایاں ترین کاموں میں شریعت بل کی منظوری، ''حسبہ بل''، میٹرک تک مفت تعلیم کا انتظام، شراب پر مکمل پابندی، اُردو زبان کو سرکاری زبان قرار دینے کا نوٹیفکیشن، وی آئی پی کلچر کا خاتمہ، قیامِ امن کے لیے مؤثر اقدامات، خواتین کے لیے علیحدہ یونیورسٹی اور میڈیکل کالج کا قیام وغیرہ

شامل ہیں۔ ۲۰۰۸ء کے انتخابات میں جمعیۃ علماء اسلام واحد مذہبی جماعت کے طور پر پارلیمنٹ میں پہنچی۔

جمعیۃ علماء نے اسمبلی میں ناموسِ رسالت ﷺ کے قانون کو تبدیل کرنے کی کوشش کا مقابلہ کیا چنانچہ حکومتی ممبران کو اپنی اپنی قراردادیں واپس لینی پڑیں، لاہور میں آئین شریعت کانفرنس کی کامیابی، دار العلوم دیوبند کی ڈیڑھ سوسالہ خدمات کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے پشاور میں عالمی کانفرنس کا انعقاد، اسلام زندہ باد کانفرنس کا ملک بھر میں جال، پنجاب اسمبلی میں تحفظِ حقوقِ نسواں بل کے نام سے غیر شرعی بل کا تنقیدی جائزہ اور جرأت مندانہ اقدام کے باعث اس بل کا غیر مؤثر ہونا، قومی اسمبلی میں حلال فوڈ اتھارٹی بل کی منظوری، آئین پاکستان میں اسلامی دفعات کا تحفظ وغیرہ یہ تمام کارنامے جمعیۃ علماء اسلام نے انجام دیے، یہ ہے جمعیۃ علماءِ اسلام کی شاندار تاریخ اور تابناک ماضی۔

ان امور کے پیشِ نظر جمعیۃ علماء اسلام کی مرکزی مجلس شوریٰ نے فروری ۲۰۱۶ء میں فیصلہ کیا کہ چونکہ آئندہ سال ۱۴۳۸ھ میں جمعیۃ علماء کے قیام کو ہجری سال کے اعتبار سے سوسال مکمل ہو رہے ہیں اس لیے جمعیۃ علماء کی خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے ''صد سالہ عالمی اجتماع'' منعقد کیا جائے چنانچہ اس فیصلہ کے مطابق گزشتہ ماہ ۷، ۸، ۹ اپریل ۲۰۱۷ء کو اَضاخیل نوشہرہ میں یہ عظیم الشان اجتماع منعقد ہوا، اس اجتماع میں ہندوستان سے دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حضرت مولانا ابوالقاسم صاحب نعمانی مدظلہم، جمعیۃ علماءِ ہند کے جنرل سیکرٹری حضرت مولانا سیّد محمود مدنی مدظلہم سمیت کئی مقتدر شخصیات نے شرکت کی نیز سعودی عرب کے وزیر مذہبی اُمور شیخ ڈاکٹر صالح عثمان، امام حرم شیخ صالح بن محمد بن ابراہیم آل طالب، بحرین کے وائس سپیکر عادل عبدالرحمن بطورِ خاص اس اجتماع میں شرکت کے لیے تشریف لائے، مزید کئی ممالک مثلاً بنگلہ دیش، ایران، نیپال، قطر، برطانیہ، امارات جنوبی افریقہ اور ہانگ کانگ کے وفود نے بھی اس عالمی اجتماع میں شرکت کی سعادت حاصل کی، پاکستان میں اقلیتوں کی نمائندگی کرتے ہوئے مسیحی برادری کے بشپ نذیر عالم نے شرکت کی اور خطاب کیا، پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنما قومی اسمبلی کے اپوزیشن لیڈر جناب سیّد خورشید شاہ اور سینٹ کے چیئرمین جناب رضا ربانی صاحب، مسلم لیگ (ن) کے رہنما محترم راجہ ظفر الحق صاحب، جماعتِ اسلامی کے سربراہ جناب سراج الحق صاحب نے اس عالمی اجتماع سے خطاب کیا۔

اس عظیم الشان اور پُر اثر اجتماع سے مندرجہ ذیل پیغامات دیے گئے :

(۱) باہمی رواداری، انسانیت کا احترام اور دین اسلام کی عالمگیریت کے حوالہ سے امن محبت اور اُخوت و بھائی چارہ اپنانے اور ان تمام اُمور کے فروغ دینے کی تعلیم پر زور دیا گیا۔

(۲) وطنِ عزیز پاکستان میں عسکریت کا کوئی جواز نہیں، ہر قسم کی جدوجہد پارلیمانی سیاسی اور آئینی ہی ہوگی، اس سے ماورا کسی قسم کی کوششوں اور جدوجہد سے جمعیۃ علماءِ اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے اس لیے کہ میدانِ سیاست میں جمعیۃ علماءِ اسلام کی تاریخ پُرامن اور دستوری جدوجہد کی آئینہ دار ہے اس حوالے سے قائد جمعیۃ حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم کے خطبہ صدارت کے ان الفاظ پر غور فرمایئے :

''پوری دنیا میں جہاں جہاں جمعیۃ علماء موجود ہے اُن کے وفود یہاں پہنچ چکے ہیں جو اس بات کا پیغام دے رہے ہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے جو فلسفہ امن دیا تھا جو نظریہ دیا تھا اُس پر کام کرنے والے لوگ پوری دنیا میں موجود ہیں، پُرامن سیاسی جدوجہد صرف پاکستان میں موجود جمعیۃ کا منہج نہیں، ہر سطح پر پوری دنیا میں حضرت شیخ الہندؒ کے روحانی فرزند اسی راستہ پر رواں دواں ہیں۔''

(۳) ہر قسم کے اندرونی اور بیرونی فساد سے تمام مسلمانوں کو بچانے کی کوشش کی جائے اور اجتماعیت اور اپنی طاقت کو مناسب وقت کے لیے بچا کر رکھا جائے۔

(۴) وطنِ عزیز میں تیزی سے بدلتے ہوئے معروضی حالات کے پیشِ نظر اپنی صف بندی کی جائے اور ہر قسم کے چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کی جائے۔

(۵) پوری ملت اِسلامیہ کے اتحاد اور وحدتِ اُمت پر زور دیا گیا، اضطراب و انتشار سے دُور رہنے کی تلقین کی گئی اور ہر قسم کی فرقہ واریت اور عدم برداشت کی مذمت کی گئی۔

(۶) اسلام امن و محبت، اعتدال اور برداشت کا دین ہے، دہشت گردی اور دہشت گردوں سے اسلام کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۷) دینی مدارس کے خلاف ملکی اور غیر ملکی سطح پر طاغوتی قوتوں کا پروپیگنڈہ بہت عام ہے اور بلاوجہ دین کی حفاظت کے اِن قلعوں کا عسکریت پسندی سے تعلق جوڑا جاتا ہے اس اجتماع سے دینی مدارس کے سراپا خیر ہونے اور دہشت گردی سے اِن کا کسی قسم کا تعلق نہ ہونے کا پہلو بھی اُجاگر کیا گیا

(۸) سوشل میڈیا پر گستاخانہ مواد ناقابل برداشت ہے اس کی بھرپور مذمت کی گئی۔

(۹) وطن عزیز میں قانونِ توہین رسالت کے حوالہ سے کوئی تبدیلی برداشت نہیں کی جائے گی۔

جمعیۃ علماءِ اسلام کے مرکزی امیر حضرت مولانا فضل الرحمن صاحب مدظلہم اور جمعیۃ علماءِ اسلام پاکستان کے تمام رہنما اور کارکن عظیم مبارک باد کے مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس عالمی اجتماع کے اثرات ظاہر فرمائے اور عالم اسلام کو ان اثرات سے بہرہ مند فرمائے اور تمام اُمتِ مسلمہ بالخصوص وطنِ عزیز پاکستان کی حفاظت فرمائے، آمین۔

بقیہ: مسلم دنیا کے احوال

۔ترکی میں موجود ویسٹرن یونین کے ذریعے شام، قوم پہنچاتی ہیں اور وصول کرتی ہیں۔ ترک صدر جب طیب اردوان خود کہہ چکے ہیں کہ ان کے پاس ثبوت موجود ہیں کہ داعش اور اس کے اتحادیوں کی امریکہ اور اس کے اتحادی ممالک معاونت کرتے ہیں۔ یاد رہے کہ ترکی کی داعش پر حملوں کے عنوان سے شام میں براہ راست کاروائیاں کر چکا ہے۔ حال ہی میں شام کے شمالی شہر حلب پر شدید ترین بمباری کے بعد حکومتی افواج نے دوبارہ قبضہ حاصل کر لیا ہے۔ 2011ء کی ''عرب بہار'' کے دوران سے بشارالاسد کے خلاف شروع ہونے والی کاروائیوں کے سلسلے میں جولائی 2012ء میں حلب پر حکومت مخالف گروہ کا قبضہ ہوا تھا۔ ستمبر 2015ء میں شامی حکومت کے تحفظ و بقاء کیلئے روس بھی براہ راست معاونت اور مداخلت پر اترا۔ اس پورے عرصے کے دوران انسانی خون کی ارزانی، املاک کی تباہی، لاکھوں لوگوں کے بے خانمائی اور ہجرت کے ہزاروں روح فرسا واقعات کا ظہور ہوا۔ پانچ سال کے دورانیہ میں شامی قضیے نے مشرق وسطی کو واضح طور پر دو فرقہ وارانہ گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کا یہ عمل اس بات کا غماز ہے کہ صدام حسین شہید نے ربع صدی قبل درست کہا تھا کہ: ''ام الحروب کا آغاز ہو گیا ہے'' کیونکہ اس فرقہ وارانہ تقسیم نے پورے جزیرہ نما عرب کا مستقبل جنگ و جدل اور قتل و غارت گری سے جوڑ دیا ہے۔ شام، روس تعلقات 1970-71ء سے قائم ہیں سرد جنگ کے عہد میں شام سویت بلاک کا حصہ تھا۔ سویت یونین نے شام کی ساحلی شہر طرطوس میں بحری اڈہ قائم کیا تھا۔ شام اسلحہ کی خریداری کے لئے زیادہ تر انحصار روس پر کرتا رہا ہے، 2007-11 کے درمیان شام نے اٹھتر فیصد اسلحہ روس سے خریدا۔ یہ عمل واضح کرتا ہے کہ روس اپنے اتحادی اور گاہک کے ذریعے اپنے معاشی مفادات کے تحفظ کے لئے کھل کر بشارالاسد کی حمایت میں آیا ہے۔ دوسری بات بحر روم آبی راستوں کے استعمال کا معاملہ ہے۔ روس کے لئے طرطوس کے ذریعے بحری آمد و رفت کا بہتر تحفظ اسی طرح ممکن ہے کہ بشارالاسد یا اس جیسا ہی کوئی حکمران شام کے اقتدار پر ممکن ہے۔ (بشکریہ ماہنامہ ''الجمعیۃ'' راولپنڈی)

بقیہ: فلسفہ کیا؟ فلسفے کا رد

استعمال ہونے والے منہ دھوکے صابن سے لے کر گھر میں پکنے والی دال سبزی تک، آپ کے بجلی کے بل میں ساٹھ روپے پی ٹی وی لائسنس کی فیس سے لے کر ٹی وی میں آنے والے مارننگ شو تک ہر چیز کے پیچھے ایک مکمل فلسفے کا فعال عمل دخل ہے جس فرد کی حیثیت سے نظر انداز ضرور کیا جا سکتا ہے، لیکن دنیا کی موجودہ صورتحال اپنی ایک ایک جنبش میں ''اتفاقات'' پر نہیں، بلکہ ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی منحصر ہے۔

فکر و تدبر

حضرت قائد جمعیت کی فکر کو عام کرنے کی ضرورت ہے

محمد ادریس اپل

جو شخص اسلام کے فکر و فلسفہ کو قبول کر کے ایمان لے آتا ہے اس کی فطرت کا یہ پہلو نمایاں ہونا شروع ہو جاتا ہے کہ دوسرے لوگ بھی اس کے فکر و فلسفہ اور ایمان و عمل کو قبول کر کے اس کے اور ساتھی اور ہم قدم بن جائیں اور ایک ہم آہنگ زندگی گزاریں، ہم آہنگ زندگی سے انہیں معاشرتی امن و حسن خوب صورتی کی زندگی عطاء ہو۔ اسی جذبے نے انسانی معاشروں میں مختلف تحریکوں کو جنم دیا۔ ان میں علمی تحریکیں بھی تھیں جنہوں نے اسلام کے علمی غلبے کو ثابت کیا، وہ فلسفیانہ تحریکیں بھی تھیں جنہوں نے فلسفے کے میدان میں اپنی نظریاتی برتری ثابت کی۔ ان میں روحانی تحریکیں بھی تھیں جنہوں نے خانقاہی نظام کے ذریعے عوام کو شعوری زندگی گزارنے کیساتھ دلوں پر اثر انداز ہو کر معاشرتی ہم آہنگی پیدا کر کے اپنی جدوجہد سے جوڑ کر انسانیت کو محور بنایا اور خدا اور انسان سے محبت کے ذریعے مثالی امن دیا۔ ان میں سیاسی تحریکیں بھی تھیں۔

عصر حاضر میں کچھ تحریکوں کا تذکرہ ضروری ہے۔ سب سے پہلی تحریک خانقاہ گنگوہ کے ایک خدا مست بزرگ حضرت شاہ محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ذریعے اٹھی اور بہت جلد شہرت حاصل کر کے عالمگیر اثرات کی حامل تحریک بن گئی۔ اس تحریک نے اسلام کے بنیادی اعمال کو اپنی دعوت کا ذریعہ بنایا، لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں انسانوں کو راہ ہدایت پر لگایا اور ان کے عقائد و اعمال کی اصلاح کی۔ کروڑوں لوگ ایمان کی دولت سے سرفراز ہوئے۔ اس تحریک کو عام مسلمانوں میں بہت پذیرائی ملی اور دنیا میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں اسکے داعی نہ پہنچے ہوں۔ دعوت و اصلاح کی اس تحریک کا اب کوئی کنارہ نہیں۔

دوسری سب سے بڑی اور اہم تحریک ''تحریک شیخ الہند'' ہے جو استعمار کے غلبہ کے خلاف ایک تحریک تھی۔ یہ پہلے ایک انقلابی تحریک تھی جس نے استعمار کے خلاف عالمی راہنماؤں سے مل کر جوڑ توڑ کا انداز اپنایا اور آزادی کے لیے عالمگیر جنگ کے راہنماؤں سے یقین دہانیاں حاصل کیں، اس میں بڑی حد تک مسلح جدوجہد بھی شامل تھی جس کی تائید عالمی راہنماؤں نے بھی کی تھی۔ لیکن خلافت عثمانیہ اور جرمنی کے اتحاد کی شکست کے بعد سارا پلان ہی ناکام ہو گیا۔ تو اب یہ تحریک، شیخ الہندؒ کے مکتب فکر کی صورت اختیار کر گئی اور یہ مکتب فکر آئینی، سیاسی جدوجہد میں ڈھل گیا۔ شیخ الہندؒ نے اسلام کے سیاسی غلبے و جدوجہد کیلئے جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد رکھ کر علماء کی جدوجہد کیلئے راہ متعین کر دی کہ علماء آئینی اور سیاسی جدوجہد کے ذریعے مسلمانوں کے دین اور ان کی حیثیت کا دفاع کریں گے اور اپنی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے بعد مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اس سیاسی اور آئینی جدوجہد کو آگے لے کر بڑھے اور شیخ العرب والعجم اور شیخ الاسلام کہلائے۔

جمعیۃ علماء ہند اگرچہ ایک سیاسی جماعت رہی لیکن اس کا علمی ارتباط دارالعلوم دیوبند سے رہا۔ دارالعلوم دیوبند کے علمی ارتباط کی وجہ سے اس کے فارغ التحصیل اکثر علماء جمعیۃ علماء ہند کی فکر سے وابستہ اکثر شریک جدوجہد ہوتے تھے، یہی وجہ ہے کہ دارالعلوم کے فضلاء جو بھی اپنے علمی اثاثے و مہارت کے ساتھ دنیا بھر میں پہنچے اور وہاں مدارس مکاتب قائم کیے تو علماء کی علمی مہارت، تبحر اور پختگی کے ساتھ علماء کا فکر و فلسفہ بھی وہاں پہنچا اور انہوں نے اسلام کی اقتصادی، معاشی، معاشرتی نظریہ و فکر کو متعارف کرایا اور ساتھ ہی سامراج کے ہتھکنڈوں کی تعارف کروا کر اس سے بچنے کی منصوبہ بندی کا احساس دلایا۔

1947ء میں ہندوستان یعنی برصغیر دو حصوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک حصہ مسلمانوں کے لیے الگ وطن قرار پایا یہاں مسلمانوں کی حکومت معرض وجود میں آ گئی۔ علماء کی خاطر خواہ تعداد جو پاکستان میں موجود تھی یہاں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی قیادت میں جدوجہد آئینی انداز میں شروع ہوئی اور قرار داد مقاصد آئین کا حصہ بنی۔ 1956ء میں پارٹی کی تنظیم نو ہوئی اور منظم انداز میں کام شروع ہوا۔ پورے ملک میں اس کی تنظیمی شاخیں قائم ہوئیں، باقاعدہ سیکرٹریٹ بنا۔ جماعتی آرگن کا افتتاح ہوا اور جمعیۃ علماء اسلام اس قابل ہوئی کہ وہ 1970ء میں پارلیمنٹ کا حصہ بن سکے۔ لہٰذا 1970ء کے انتخابات میں پہلی بار پارلیمنٹ میں پہنچی اور ساتھ ہی پاکستان کے دو صوبوں سرحد (کے پی) اور بلوچستان میں مخلوط حکومتیں بنانے میں بھی کامیاب ہو گئی۔ صوبہ سرحد (کے پی کے) میں مولانا مفتی محمودؒ وزیر اعلیٰ بنے، جو ایک عالم دین تھے اور ان کی شناخت مفتی اعظم پاکستان کے نام سے تھی۔ دوسری طرف مفتی محمودؒ نے ان لوگوں کیخلاف جو ملک کو آئین میں سیکولر جمہوریہ اور سوشلسٹ جمہوریہ قرار دینا چاہتے تھے، ایک بھرپور جدوجہد کی اور اپوزیشن کو متحد کر کے پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دلوایا۔ حضرت مولانا مفتی محمودؒ نے اپنے صوبے میں اسلامی اقدامات کر کے پوری دنیا سے خراج تحسین سمیٹا۔ عرب سربراہوں اور دیگر ممالک سے مبارکباد کے پیغامات آئے۔ یوں جمعیۃ علماء اسلام پہلی بار عالم عرب اور عالم اسلام میں متعارف ہوئی۔

1970ء سے لے کر اب تک جمعیۃ علماء اسلام پارلیمنٹ کا حصہ ہے اور پاکستان کے آئین کے خلاف شریعت دفعات کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کے لیے حکمرانوں پر اپنا دباؤ برقرار رکھے ہوئے ہے۔ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے آئین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی آئینی جدوجہد میں تنہا اور یکتا ہے، اس کے سربراہ کو ''قائد جمعیۃ'' کہا جاتا ہے۔ جن کی شخصیت دنیا بھر میں کسی تعارف کی محتاج نہیں رہی۔

1960ء اور 1970ء کے عشرے میں مصر میں اخوان المسلمون کا شہرہ تھا۔ یہ ابتداء میں ایک دعوتی تحریک تھی جو معاشرے کو اسلامی اقدار سے روشناس کرانے اور الحاد کا راستہ روکنے کیلئے سرگرم عمل تھی۔ حسن البناء اور سید قطب اس کے راہنما ٹھہرے، اس کے سربراہ مرشد عام کہلائے۔ لیکن یہ تحریک جلد ہی غلط راستوں پر جا نکلی اور اس کی کام اور جدوجہد کا محور سامراج کی ایماء پر حکمرانوں کا تختہ الٹنا ٹھہرا، چنانچہ یہ مصر کے سامراج دشمن صدر جمال عبدالناصر کا تختہ الٹنے کی سازش میں پکڑے گئے اور انور سادات کی فوجی عدالت سے موت کی سزا پائی۔ ایک روشن تحریک جو جمہوری انداز میں جدوجہد کر کے انقلاب برپا کر سکتی تھی، وہ ایسے راستے میں چلی گئی جو بالکل تاریک تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی اس نے اپنا وطیرہ نہ بدلا کہ انور سادات کے قتل کا الزام بھی اس کا نام دھرا جاتا رہا۔ اسلامی شناخت بنا لینے کے بعد سامراجی حلقوں میں اس کا ماتم برسوں ہوتا رہا اور پاکستان کی جماعت اسلامی اپنے سامراجی رجحانات کی وجہ سے سینہ کوبی کرتی اور مرثیے پڑھتی رہی۔

آج بھی مصر میں اخوان المسلمون اسلامی شناخت کی حامل جماعت ہے اور مصر کی سیاست میں اپنا مقام رکھتی ہے۔ پچھلے انتخابات مین شاید اسے یہ سمجھ آ گئی حکمرانوں کا تختہ الٹنے کی سوچ کے علاوہ جمہوریت کے ذریعے بھی اپنا پیغام پہنچایا جا سکتا ہے اور اصلاح کی تحریک چلائی جا سکتی ہے۔ حسنی مبارک کے اقتدار کا خاتمہ ہوا تو اخوان المسلمون کے محمد مرسی صدر منتخب ہو گئے، لیکن سیاسی ناپختگی اور جلد بازی کی وجہ سے اپنے ساتھیوں اور اتحادیوں کو ساتھ نہ لے کر چل سکے جس سے فوج کو ایک بار پھر مصر کے اقتدار اعلیٰ پر قبضہ کا موقع مل گیا۔

پاکستان میں دوسری جماعت جماعت اسلامی تھی، جس کی تاسیس تو متحدہ ہندوستان میں غالباً 1937ء میں ہوئی۔ ''امیر جماعت'' نے دین کے معاملے میں علماء کو اتھارٹی سمجھنے کی بجائے علماء کے مقابل خود کو دینی اتھارٹی ثابت کرنے کو مطمح نظر بنا لیا۔ اس دوران مولانا مودودی کے قلم سے کچھ ایسی تحریریں سامنے آئیں جس سے علماء اور جماعت اسلامی کے درمیان ٹھن گئی۔ اس طرح مولانا مودودی نے دور اسلامی تحریکوں کے درمیان ایک ایسی اونچی دیوار قائم کر دی جس کے اوپر سے جھانکنا بھی مشکل تھا۔ سیاسی اور فکری طور پر جماعت اسلامی اخوان المسلمین کا چربہ بن کے رہ گئی۔ پاکستان میں سوشلسٹ فکر کا سنجیدہ مقابلہ کرنے کی بجائے انہوں نے علماء دیوبند کو ہی سوشلسٹ قرار دیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہزار دعوؤں اور خوش فہمیوں کے باوجود پارلیمنٹ میں صرف تین نشستیں ملیں، جبکہ جمعیۃ علماء اسلام پارلیمنٹ میں ان سے زیادہ نشستیں لے گئی۔

جمعیۃ علماء اسلام اپنی ترکیب میں دوسری سیاسی جماعتوں کی طرح نہیں۔ جمعیۃ علماء اسلام علماء کی جماعت ہے اور اس کے ساتھ ہی ملک بھر سے خطباء کی اکثریت بھی اس سے ناطہ جوڑے ہوئے ہے، جو براہ راست عوام الناس میں سیاسی اور مذہبی شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہزاروں مدارس کے اساتذہ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں اور طلبہ بھی معاشرے میں اسلامی اقدار کے احیاء اور ملکی نظام کے بارے میں بہتر سوچ پیدا کرنے سے منسلک ہیں اساتذہ حدیث، قرآن کے بہترین عالم اور بے مثال فقیہ، سکالرز اور دانشور اس کا حصہ ہیں۔ نچلی سطح کی تنظیم سے لے کر اعلیٰ سطح کی تنظیم تک علماء متحرک ہیں۔

دینی مدارس کے طلبہ اور اساتذہ اسلامی تہذیب کی احیاء و تعمیر میں بہترین کردار ادا کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے امریکہ و برطانیہ دینی مدارس کے خلاف منفی پروپیگنڈے کے سہارے ان دینی مدارس کو بند کرنے کے لیے حکومتوں پر دباؤ ڈالتے رہے ہیں۔ انہی مدارس دینیہ کے فارغ التحصیل طلبہ پوری دنیا میں مدارس اور مساجد میں فرائض سرانجام دے رہے ہیں اور جمعیۃ کی فکر کے داعی اور منادی ہیں۔

دنیا بھر میں جمعیۃ علماء اسلام کی شاخیں کام کر رہی ہیں اور صحیح اسلامی فکر کی جانب راہنمائی کرتی ہیں، جو نہ فرقہ واریت سے کوئی علاقہ رکھتی ہے، نہ دہشت گردی اور انتہا پسندی سے ان کا کوئی جوڑ ہے۔ بلکہ اعتدال کی راہ اپنائے ہوئے ہیں۔ دین کی دعوت کا کام علماء کے پاس ہے، اسکے قائد بہت بڑے عالم اور علماء میں انہیں درجہ احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

علماء کا سب سے بڑا حریف میڈیا ہے جس پر امریکہ ایک لاکھ ڈالر سالانہ خرچ کر رہا ہے، جس کا اظہار امریکی صدر اوبامہ نے ایک پریس کانفرنس میں کیا۔ اسی طرح سینکڑوں غیر ملکی این جی اوز اسلامی فکر کو بدلنے اور لوگوں میں اسلامی نظریات واحکامات کے بارے میں تشکیک پیدا کرنے اور انہیں اسلام سے متنفر کرنے کے لیے سرمایہ خرچ کر رہی ہیں اور اس مقصد کے لیے دھڑا دھڑا رقوم باہر سے آ رہی ہیں۔

کچھ عرصہ پہلے علماء کی آواز اور ان کی فکر میڈیا کے شور تلے دب گئی اور علماء کو مسلح جدوجہد اور دہشت گردوں کا حامی گردانا گیا۔ ان میں جمعیۃ علماء اسلام نشانہ بنی تو قائد جمعیۃ نے قائدانہ حیثیت رکھنے والے پاکستان کے **500** علماء کو جمع کیا اور ان کے دستخطوں سے یہ اعلامیہ جاری ہوا کہ: دین کے نام پر ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد حرام ہے، خودکش حملے حرام ہیں۔ دہشت گردی سے ہمارا کوئی تعلق نہیں، دہشت گرد اسلام کو بدنام کرنے کیلئے آلہ کار بنے ہوئے ہیں' اس اجتماع میں ہر قسم کی دہشت گردی کی مذمت کی گئی اور دنیا کو بتا دیا گیا کہ جمعیۃ علماء اسلام پاکستان کے آئین کے مطابق اسلامی اقدار کے احیاء اور آئین کو غیر اسلامی دفعات سے پاک کرنے اور اسے مکمل اسلامی بنانے کے لیے جدوجہد کرتی رہے گی۔

کچھ عرصہ قبل تک تو عام سوچ یہ تھی کہ مجوزہ صد سالہ عالمی اجتماع کا مقصد علماء کی سو سالہ جدوجہد کو سامنے لانا اور اس جدوجہد کے تسلسل کو ثابت واجاگر کرنا ہے کہ علماء نے قربانیاں دے کر دین کو جو خدمت کی ہے وہ بے مثال ہے اور ان کی جدوجہد تسلسل کے ساتھ جاری ہے اور جاری رہے گی اور یہ کہ سو سالہ جدوجہد کا تسلسل ٹوٹنے نہیں پائے گا۔ علماء کی سو سالہ جدوجہد کو اجاگر کرنا، اس کے تسلسل کو ثابت کرنا اور اس تسلسل کو برقرار رکھنے کا عزم کرنا، کارکنوں کو تنظیمی اور فکری شعور سے روشناس کرانا، اندرون ملک اپنی طاقت کا اظہار کرنا اور کارکن کی توجہ ایک مشکل چیلنج (عالمی اجتماع) کی طرف مرکوز کر کے جماعتی نظم کو مضبوط بنانے کا موقع فراہم کرنا، وغیرہ مقاصد اپنی جگہ......لیکن اب اس کانفرنس کے مقاصد کا فکری پہلو زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کہ قائد جمعیۃ کی فکر کو عام کر کے دلائل وتشریحات سے اسے ایک مکمل دعوت بنایا جائے۔ یہاں ان کی فکر کا کچھ تذکرہ کیا جاتا ہے، جسے مربوط انداز میں لے کر آگے چلنے کی ضرورت ہے۔ یوں تو ماہنامہ ''الجمعیۃ'' قائد جمعیۃ کی مختلف فورم پر کی گئی تقاریر کو لوگوں تک پہنچا رہا ہے اور کارکن سرسری طور پر اس سے مستفید ہو رہے ہیں۔ لیکن اسے محض تقاریر کی بنیاد پر لیا جا رہا ہے جسے پڑھ کر ذہنی آسودگی اور تسکین حاصل کر لی جاتی ہے، لیکن اسے فکری طور پر نہیں لیا جا رہا کہ اسے اپنی دعوت کی بنیاد بنایا جا سکے۔

قائد جمعیۃ کی فکر کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ ہر معاملہ اور ہر میدان میں اعتدال کی راہ اپنائی جائے، افراط وتفریط سے گریز کیا جائے، کیونکہ افراط وتفریط علم وعمل میں انتہا پسندی کو ختم کر دیتی ہے ان کا کہنا ہے کہ:'' اسلام در حقیقت اعتدال کا نام ہے اور اعتدال کمال کا نام ہے۔ اگر اعتدال نہ رہے تو پھر افراط ہے یا تفریط۔ اور افراط وتفریط دونوں نقائص ہیں، یہ دہشت گردی، انتہا پسندی اور شدت پسندی جس کا الزام مسلم امہ کو دیا جاتا ہے آج تک کسی بین الاقوامی فورم یا بین الاقوامی ادارے میں جن کا دعویٰ ہے کہ علم ہمارے پاس، ہم دانشور ہیں بڑی بڑی دانش گاہوں سے نکل کر آئے ہیں ان اصطلاحات کی تعریف **(Defination)** نہیں کی۔

قرآن کریم نے اس امت کے لیے نشان دہی کی ہے کہ یہ امت میانہ رو ہے، معتدل ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ امت جذبات میں، غصہ اور تعصّبات میں جادۂ اعتدال سے نہیں ہٹتی اور کوئی بھی مسئلہ ہو، اسے جذباتی پہلو سے ہٹ کر اس کے اصولی اور سنجیدہ پہلو پر اپنے عمل کی بنیاد رکھتی ہے۔

قائد جمعیۃ مدظلہ کا اس بابت میں یہ فرمان ہے کہ: علم ایک بنیادی چیز ہے اور دنیا میں جتنی افراط وتفریط ہے یا اس سے متعلق کاروائیاں اور جنگیں ہیں، وہ دراصل جہالت کا نتیجہ ہیں۔ اگر علم نہیں ہے تو تو انسان ایک وحشی کی مانند ہے۔ اپنے مزاج اور خواہشات کے تابع ہے۔ خواہشات کو قابو میں رکھنا اور انہیں اعتدال پر لانے کا سبب علم ہے۔ ہمارے پاس قرآن پاک زندگی گزارنے کا دستور العمل ہے۔ اور قرآن کریم کی تربیت اور قرآن کے علم اور رہنمائی نے ہمیں اعتدال بخشا ہے اس لیے ہم ایک میانہ رو امت ہیں۔

قائد جمعیۃ اپنے فکر کو سمجھانے کے لیے اعتدال کا پہلا مظہر ومصداق اور پہلی تعبیر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی عملی زندگی کو قرار دیتے ہیں، جنہیں براہ راست رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور ان سے راہنمائی لینے کا شرف حاصل تھا۔ اب یہ تعین کرنا کہ جو شخص اپنی انفرادی، معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں صحابہ کی عملی زندگی کے قریب تر ہے، آسان ہے کہ وہ کتنا اعتدال پسند ہے۔ دوسرا حوالہ وہ اپنے اکابر کا دیتے ہیں کہ انگریز نے دارالعلوم دیوبند اور علی گڑھ کو دو انتہاؤں پر کھڑا کر کے لڑانا چاہا۔ لیکن ہمارے اکابر حضرت شیخ الہندؒ کی قیادت میں دیوبند اور علی گڑھ میں رابطہ کرا کے اعتدال کے راستے تلاش کرتے رہے اور اسی پر گامزن رہے۔ انہوں نے ان انتہاؤں کو تسلیم نہ کیا اور جامعہ ملیہ دہلی کی بنیاد رکھی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ الہندؒ کس قدر اعتدال پسند تھے اور انہوں نے مسلمانان برصغیر کو اعتدال کی راہ دکھائی۔

قائد جمعیۃ کا کہنا ہے کہ: اکابر علماء نے دلیل واعتدال کو اپنی شناخت کے طور پر متعارف کرایا ہے۔ علم، دلیل، استدلال اور اعتدال کا طریقہ انہی سے ہمیں ملا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ علم، دلیل، استدلال ہی انسانی مزاج کو اعتدال پر قائم رکھتی ہیں۔ جہالت، جذباتیت، عصبیت اور بے دلیل سوچ انسان کو انتہا پسندی کی طرف لے جاتی ہیں۔

قائد جمعیۃ کا تجربہ یہ ہے کہ پورے دین اور پوری انسانیت کی راہنمائی کا اساسی منبع قرآن کریم ہے۔ قرآن کریم زندگی میں اترتا ہے تو اس سے ایک طرز زندگی وجود میں آتا ہے اس طرز زندگی کو ''امتِ وسط'' کے الفاظ میں ایک شناخت دی گئی۔

''امت وسط'' میانہ رو، معتدل، جذبات وعصبیت سے ہٹ کر فیصلے کرنے والی امت کو امریکہ اور یورپ نے ایک متعصّبانہ شناخت دے کر مشہور کیا ہے اور اسلامی دنیا کے کوڑے دان سے چند متعفن ٹکڑے لے کر اسلام کی شناخت کے طور پر پیش کیا ہے۔ کچھ لوگ اگر بندوق اٹھا کر جاتے ہیں، اور ریاست کو چیلنج کرتے، اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں تو مغرب اس رویے کو اسلام سے منسوب کر دیتا ہے اور لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمانوں کا دعوت وتبلیغ کا انداز، پوری دنیا میں پھیلی ہوئی لاکھوں مساجد اور مدارس کے علماء کا کردار، عوام کی نظروں سے اوجھل رکھا جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا پہاڑوں میں چھپے، بندوق اٹھائے ہوئے اسلام کا مطالبہ کرنے والے چند ہزار لوگ اسلام کے نمائندہ ہیں یا ملک کی سب سے بڑی فکر رکھنے والی جماعت جمعیۃ علماء اسلام، جس کے ہمنواؤں کی تعداد کروڑوں میں ہے وہ اسلام کے نمائندہ ہیں؟

قائد جمعیۃ دوٹوک انداز میں کہتے ہیں کہ یہ مغرب کا دانستہ ایجنڈا ہے، جس سے اسلام کو بدنام کیا جا سکے

اور دینی فکر اور اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کی جدوجہد کو دھندلایا جاسکے۔ قائد جمعیۃ اسے مغرب کا ایجنڈا قرار دے کر اس کا حل اور اس پروپیگنڈے کو زائل کرنے پر زور دیتے ہیں، اس لئے وہ اس امت کی شناخت اعتدال کو قرار دیتے ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ یہ دور جدید میں دینی فکر کا بیانیہ ہے۔ وہ مسلکی اختلافات میں بھی وہ اعتدال کو ہی ترجیح دیتے ہیں اور مسلکی عصبیت وعداوت اور جذباتی طرز عمل کو اپنے اکابر کی راہ سے انحراف تصور کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ گالی گلوچ، دوسرے کی دل شکنی اور اشتعال مسائل کا حل نہیں، بلکہ اس سے نفرتیں بڑھتی ہیں۔ اگر آپ گالی گلوچ کریں گے تو دوسرا بھی گالی دے گا، اگر آپ اس کے خلاف ہتھیار اٹھائیں گے تو دوسرا بھی ہتھیار اٹھائے گا، یہ اکابر علماء حق کا راستہ ہی نہیں۔ علمی پختگی، اس کی قوت، سنجیدگی و صداقت سے شائستہ انداز میں جدوجہد کرنی چاہئے، کہ ہمارے پیغمبرؐ اخلاق کے علمبردار ہیں اور اعلیٰ اخلاق کے ہتھیاروں سے دلوں کو فتح کرنا چاہئے۔

قائد جمعیۃ کا کہنا ہے کہ ہم اپنے اختلافات کو ختم کرنا بھی چاہیں تو یہ ختم نہیں ہو سکتے، لیکن رویوں میں نرمی سے ان اختلافات کی شدت کو کم کیا جاسکتا ہے اور بہت سے معاملات ٹھیک ہو سکتے ہیں۔ رویوں کی سختی سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتے، سماجی تعلقات کو ختم کر بیٹھے ہیں۔ اگر یہی رویے ہیں تو یہ امت، امت کیسے بنے گی جس کے پیغمبر عالم انسانیت کو راہ دکھانے آئے۔ ہم نے دنیا کے ساتھ چلنا ہے اور حکمت وتدبر سے دنیا کا مقابلہ کرنا ہے۔ اللہ اس کا رسول اور دین اسلام ایک عظیم انسانی گروہ جو انسانی اقدار کا علمبردار ہے، اور انسانیت کی خدمت کیلئے نکالا گیا یہ سب اس عظیم تر مقصد کے لئے وحدت کا مطالبہ کرتے ہیں۔

قائد جمعیۃ کا کہنا ہے کہ ''جب قومیں کمزور ہوتی ہیں تو ان کی کمزوری کی ابتداء باہمی انتشار سے ہوتی ہے۔ ہمارے پاس باہمی وحدت کے علاوہ کوئی پیغام نہیں۔ اللہ اور اس کا رسول ﷺ بھی ہم سے یہی چاہتے ہیں، لیکن ہماری خواہشات، جذبات ہمارے تعصبات اور شیطانی اعمال اسے گروہ در گروہ بانٹ کر عظیم مقصد سے ہٹا دیتے ہیں'' وہ عظیم تر مقصد کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اسلام کی پہلی ترجیح آزادی ہے، دوسری ترجیح معاشی خوشحالی ہے اور تیسری ترجیح پسماندہ طبقوں کو اٹھانا ہے، قرآن کریم جس ترتیب کے ساتھ ہمیں انسانی زندگی کی ترتیب دینے کی تعلیم دے رہا ہے، اسی کا نام خلافت ہے۔

جو لوگ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے فلسفے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں انہیں معلوم ہے کہ قائد جمعیۃ نے ولی اللّٰہی فلسفے کو چند لفظوں میں سمیٹ کر جامع انداز میں پیش کر دیا ہے۔ غلامی ذہنی ہو یا فکری، معاشی ہو یا معاشرتی، اس سے چھٹکارہ حاصل کئے بغیر منزل نہیں ملتی۔ سب سے پہلے وہ معبودان باطلہ سے آزادی کا درس دیتے ہیں اور ہر بت کو پاش پاش کرنا ہی لا الہ الا اللہ ہے شاہ ولی اللہؒ قیصر وکسریٰ کی بادشاہتوں پر تنقید کرتے ہیں کہ ایک گروہ انتہائی خوشحالی میں اپنے اللہ کو بھول گیا، دوسرا طبقہ انتہائی پسماندگی سے اللہ تعالیٰ اور رسول اکرم ﷺ کی تعلیمات کیلئے فرصت نہ پاکر مشقت کا شکار ہو گیا کہ اسے اپنی آخرت کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ ارتفاقات کی بحث کرتے ہیں یعنی طرز زندگی نہ انتہائی اعلیٰ قیصر وکسریٰ جیسا، نہ انتہائی پسماندہ۔ بلکہ درمیانی یعنی اعتدال فی المعیشۃ ہے، اس اعتدال فی المعیشۃ کے بعد وہ ''اقترابات'' کی بات کرتے ہیں کہ ایک بندہ مومن اسی وقت آخرت کی جدوجہد کر سکتا ہے جب وہ معاشی طور پر خوشحال ہو۔

قائد جمعیۃ جب خلافت کی ترجیحات بتاتے ہیں، تو پہلی ترجیح آزادی، دوسری ترجیح معاشی خوشحالی اور تیسری ترجیح پسماندہ طبقوں کو اٹھانا ہے۔ مطمئن طبقات ہی ہمیشہ انسانی خدمت کے پروگرام کو لے کر آگے بڑھتے ہیں۔ انتہائی پسماندگی، معاشی گراوٹ اور دریوزہ گری کا درس اسلام نے کبھی نہیں دیا۔ اگر ''اقترابات'' کے جزء سے زندگی خالی ہے تو پھر بھی عظیم تر انسانی پروگرام کی نیابت یعنی خلافت کیلئے نااہل ہے۔ یہ اقترابات اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرنے کے ذرائع ہیں، جنہیں عبادات کہا جاتا ہے۔ قائد جمعیۃ کہتے ہیں کہ اگر انسان اللہ کا بندہ ہے، عبادات سے وابستگی رکھتا ہے، تو وہ اس لائق ہے کہ خلیفہ بنے۔ اب حضرۃ شاہ ولی اللہؒ کی فکر کے مطابق انسانی اخلاق، انسان کے احوال معیشت پر ترتیب پاتے ہیں، معیشت میں خوشحالی اخلاق واقدار کو نمو بخشتی ہے۔ اس کو قائد جمعیت کہتے ہیں کہ ہمارے اکابر نے مادی اور معنوی دنیا یعنی اخلاق واقدار اور نظریات کی دنیا میں ارتقاء کی بات کی ہے۔

قائد جمعیۃ کے افکار کا ایک موضوع امن اور جنگ ہے، ان کے نزدیک ''امن'' بنیادی چیز ہے، امن طبعی اور فطری زندگی ہے، جنگیں ہمیشہ مسلط ہوتی ہیں، اور اسلام کی بنیادی تعلیم ہے کہ عافیت اور امن مانگو'' وہ اپنے اس مؤقف کو ثابت کرنے کیلئے آقائے دو عالم ﷺ کے فرمان سے استدلال کو بنیاد بناتے ہیں کہ: سلوا اللہ العافیۃ ولا تتمنو القاء العدو فاذا لقیتم فاثبتوا'' اللہ سے عافیت مانگا کرو اور دشمن سے سامنے کی تمنا نہ کرو، البتہ جب دشمن سے مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدم رہو'' وہ ایسے رویوں پر شدید تنقید کرتے ہیں جو اپنی قوت کا اندازہ کئے بغیر دشمن کی طاقت اور وسائل کو نظر انداز کر کے محض اپنے جذبات کی بنیاد پر جنگ اور جہاد کے نعرے لگاتے ہیں، اور شہادت کی دعائیں مانگتے ہیں۔

قائد جمعیۃ امن کو ایک نعمت قرار دیتے ہیں اور اس کیلئے وہ سورۃ قریش سے استدلال کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو تجارت کے لئے گرمی اور سردی میں اسفار کو مرغوب بنایا جس سے ان کو خوف سے امن دیا اور انہیں بھوک میں کھلایا۔ گویا خوشحالی اور امن اللہ کی نعمتیں ہیں اور اس کے شکر کے طور پر بیت اللہ کے رب کی عبادت کا حق جتایا اور عبادت کی ترغیب دی۔

امن کو ترجیح قرار دیتے ہوئے دوسرا استدلال وہ قرآن پاک کی ان آیات کو بنیاد بناتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ نے ایک خوشحال قوم کی مثال بیان کی: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَىِٕنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ'' اللہ تعالیٰ ایسی آبادی کی مثال دیتا ہے جہاں اطمینان بھی ہے امن بھی، جہاں رزق ہر طرف سے کھنچ کھنچ کر آتا ہے، خوشحال معیشت مہکتی زندگی کی مثال ہے کہ انسانی آبادی کو کس طرح رہنا چاہئے، پرسکون اور مطمئن۔ جب انہوں ناشکری کی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو بھوک اور بدامنی کا مزا چکھادیا'' قائد جمعیۃ کہتے ہیں کہ اگر بدامنی وبیروزگاری ہے تو پھر سوچیں کہ کہاں اور کس طرح ہم نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی ہے، یعنی پاکستان اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے جسے ہم مملکت خداداد بھی کہتے ہیں، اس میں ہم نے اللہ کے دین کے ساتھ کیا کیا؟

قوم سبا دنیا کی متمدن ترین قوم تھی، انہوں نے دو پہاڑوں کو ملا کر پانی روک کر ڈیم بنائے جس سے ان کی زمینیں سیراب ہوتی تھیں۔ سونے، چاندی کی کانیں ان کے پاس تھیں، مصالہ جات کی تجارت وہ کرتے، منقش کپڑے ان کے ہاں بنتے اور فروخت ہوتے تھے۔ مجموعی طور پر یہ بھی تاجر پیشہ قوم تھی، اس کے مکانات حیران کن تھے، انہوں نے بیس منزلہ عمارت بنائی اور ہر منزل کی اونچائی دس ہاتھ تھی۔ غرضیکہ انتہائی خوشحال لوگ تھے، لیکن انتہائی خوشحالی اللہ کی نافرمانیوں کے راستے بھی کھول دیتی ہے، اور شکر کی بجائے شرک پر آمادہ کرتی ہے اور ناشکری پر اتر آتی ہے، پھر اللہ تعالیٰ اسے مبتلائے عذاب کرتے ہیں۔ ایک جگہ اسی قوم سبا کا حال بیان کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے کہ: انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور ہم نے انہیں پارہ پارہ کر دیا، او رپھر ان کی عبرتناک کہانیاں باقی رہ گئیں، یہ افتراق وانتشار اور بدامنی سزا ہے۔

قائد جمعیۃ اشارہ کرتے ہیں کہ: ہم نے پاکستان میں اللہ کے دین کے ساتھ کیا کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ قوم نے یہ ملک لا الہ الا اللہ کی بنیاد پر حاصل کیا اور پھر اسی میں وعدہ خلافی کی کہ اللہ کے قانون کو پس پشت ڈال دیا، دین کا مذاق اڑایا، دین کے علمبرداروں کو حقیر جانا گیا اور اسلامی احکامات وتعلیمات کا تمسخر اڑایا گیا۔ اسلام کے نفاذ کو مختلف حیلوں بہانوں سے ٹالا گیا، چنانچہ امن برباد ہو گیا، مسلمان مسلمان کا گلا کاٹنے لگا، فرقہ واریت کے عفریت نے قوم کا گلا گھونٹ دیا، کراچی جیسا شہر امن ایک مقتل کا نقشہ پیش کرنے لگا۔ وہ بم دھماکے اور ہلاکتیں جو ضیاء کے دور سے شروع ہوئے تھے، 2016 تک جاری ہیں۔ قوم سے امن چھین لیا گیا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس ناشکری کی سزا تھی، پھر بے روزگاری عام ہوئی 61٪ طبقہ خط غربت سے نیچے زندگی گزارنے لگا، اللہ نے بھوک اور خوف کا مزہ چکھا دیا، کوئی اس نہج پر سوچے کہ ملک مکمل امریکہ کی غلامی میں چلا گیا۔ پہلی ترجیح آزادی بھی ختم ہوئی، معاشی خوشحالی بھی ختم ہوئی اور پسماندہ طبقے مزید پسماندہ ہوئے، اخلاقی گراوٹ کا سفر بھی جاری رہا۔

قائد جمعیۃ امن اور خوشحالی کا تعلق موجودہ جنگ سے جوڑتے ہیں۔ نائن الیون کے بعد دہشت گردی کے

خلاف جو مصنوعی جنگ چھیڑی گئی، قائد جمعیۃ کے مطابق یہ جنگ ہماری ضرورت نہیں، بلکہ امریکہ کی ضرورت ہے اوران کے توسیع پسندانہ عزائم کا تقاضا ہے۔وہ تواس دنیا پر اپنی سیاسی بالادستی قائم کرنا چاہتے ہیں اور قوموں کے وسائل پر براہ راست قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔امریکہ ومغرب کو معلوم ہے کہ مسلمان کو ذرا بھڑکادو، جب یہ بھڑکے گا تو یہ جہاد کے نام پر سیدھا میدان میں نکلتا ہے، اس کی طاقت کچھ بھی نہیں، اس کے پاس جنگ کے لئے صرف خنجر ہے، وہی اس کی طاقت ہے۔اس کا مجھ پر خنجر اٹھانا میرے لئے توپ چلانے کا جواز فراہم کرتا ہے۔امریکہ ومغرب کو پتہ ہے کہ جب یہ جذباتی ہو کر میرے خلاف لڑنے کے لئے نکلے گا تو میں اسے کچل کر رکھ دوں گا۔ قائد جمعیۃ کا تجزیہ یہ ہے کہ جنگ امریکہ ویورپ نے ہم پر مسلط کر رکھا ہے، وہ چاہتے ہیں کہ ہم جذبات میں آئیں اور لڑیں، اس لئے وہ مسلمانوں کو مشتعل رکھتے ہیں۔

حالات کے تناظر میں دیکھا جائے تو یہ جنگ مسلمانوں پر مسلط کی جارہی ہے، نائن الیون کے بعد سے اس پالیسی پر عمل ہورہا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ سارا ایک باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت ہورہا ہے۔نائن الیون کے بعد افغانستان پر چڑھائی کردی، ایک اسلامی ریاست جس نے افغانستان کو امن کا گہوارہ بنادیا تھا، امریکہ نے اسے انتشار کا شکار کرنے کیلئے شمالی اتحاد کی مدد کی اور جب احمد شاہ مسعود ہلاک ہوگئے تو مایوس ہو کر القاعدہ کو نمایاں کرکے نائن الیون کے سانحے کا الزام اس پر دھرا اور افغانستان کو 17 سالہ جنگ میں جھونک دیا، افغان عوام کی نسلیں امن کو ترس گئیں۔

پھر عراق جہاں معاشی استحکام اور امن تھا، جمہوریت کی بحالی اور صدام کی آمریت کے خاتمے کے نام سے عراق پر جنگ مسلط کرکے اس کا امن چھین لیا اور ترقی پذیر معیشت کا بیڑا غرق کردیا۔شام میں بشارالاسد حکومت کے خلاف داعش کی مدد کی گئی، لیبیا جو کہ ایک پرامن ملک، معاشی طور پر خوشحال تھا، وہاں القاعدہ کی مدد کرکے اس کو اسلامی نظام کا نعرہ دے کر قذافی سے ٹکرادیا۔سوڈان اور دیگر افریقی ممالک میں مداخلت کرکے ان کی معیشتوں کو تباہ کیا گیا، اوران کے وسائل پر قبضہ کیا گیا۔لہٰذا جنگ امریکہ ویورپ کی ضرورت ٹھہری، تاکہ وہ ان ممالک کے وسائل کو اپنے حق میں استعمال کرکے اس کے ذریعے اپنی معیشت کو مضبوط بنائیں۔غرضیکہ ان کی پالیسی یہ ہے کہ جنگ کے ذریعے امن برباد کرکے معیشتوں کو کمزور کرنے کے بعد غلام بنایا جائے۔

قائد جمعیۃ کی فکر یہ ہے کہ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے خلاف جنگ کے نام پر مسلمان ملکوں کو دھمکا کر اپنا دست نگر بنانے اور غلامی قبول کرنے کے لئے دباؤ ڈالا جاتا ہے۔جنگ چونکہ ہمیشہ برابری کی بنیاد پر ہوتی ہے، لہٰذا کمزور قوموں پر چڑھ دوڑنے اور اس کے وسائل کو استعمال کرنے کو دہشت گردی کے علاوہ کوئی دوسرا کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔قائد جمعیۃ کہتے ہیں کہ ''امریکہ (استعمار) طاقت کے میدان میں شکست نہیں کھاتے (جب تک ان کے ہم پلہ قوت سے ان کا مقابلہ نہ ہو) لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ وہ دلیل کے میدان میں ہمارا مقابلہ نہیں کرسکتے، اس لئے وہ ہم پر جنگ مسلط کردیتے ہیں۔قائد جمعیۃ کا منشایہ ہے کہ ہم امریکہ ویورپ کی سازش کو سمجھیں اور جذباتی فیصلے نہ کریں، بلکہ اس کی سازش سے بچ کر انتہائی تدبر وحکمت کیساتھ اس سازش کا مقابلہ کریں اور اپنے ملکوں میں امن قائم کرکے معیشتوں کو مضبوط کریں کیونکہ یہ لڑائی اب معیشتوں کے درمیان منتقل ہورہی ہے، لہٰذا اولین ترجیح امن ہے اور معیشت امن سے جڑی ہوئی ہے۔

امریکہ ویورپ مختلف ملکوں میں اپنی کاروائیوں کو دہشت گردی اور انتہا پسندی کیخلاف جنگ کا نام دیتے ہیں، قائد جمعیۃ کا کہنا ہے کہ وہ اپنے خاص مقاصد کیلئے ایسا کرتے ہیں جو ان کا ایجنڈا ہے۔کیونکہ جنگ میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوتا ہے، کوئی گروہ اگر طاقت استعمال کرتا ہے اور ریاست اس کیخلاف طاقت استعمال کرتی ہے تو پھر انسانی حقوق کی حیثیت ختم ہوجاتی ہے۔کیونکہ انسانی حقوق صرف امن کی صورت میں محترم ہیں، جنگ کی صورت میں انسانی حقوق محترم نہیں رہتے، ساری دنیا میں انسانی حقوق کی بات کی جاتی ہے، اور دوسری طرف (مسلم ممالک) کو جنگوں میں جھونک کر انسانی حقوق کو تہ تیغ کیا جارہا ہے۔وہ تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: یہ سب کچھ کیا ہے، مسلم دنیا کو کن حالات سے دوچار کیا جارہا ہے؟

بڑی طاقتوں کے درمیان دنیا میں جاری اقتصادی ومعاشی مسابقت پر قائد جمعیۃ کا نقطہ نظر یہ ہے کہ:

''بین الاقوامی قوتوں کے دوطرح کے کردار سامنے آئے ہیں، ایک امریکہ مغربی دنیا کا کردار ہے، وہ جنگ کا ہتھیار استعمال کررہے ہیں، اور دوسرا کردار چین کا ہے جس نے ایک مضبوط اقتصادی ومعاشی ملک کے طور پر اپنے آپ کو متعارف کرایا ہے اور بین الاقوامی منڈیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔نائن الیون کا واقعہ ہوا، اس دوران ایشیا کی اقتصادی عمارت کی دیوار گرائی گئی اور جنگ کے وسیلے سے انہوں نے اسلامی ممالک کو کمزور کرکے ان کے وسائل پر قبضہ کرنے اور وہاں تک رسائی حاصل کرنے کیلئے مہم جوئی کا راستہ لیا، عالمی سطح پر جو جنگ ہمیں نظر آرہی ہے، یہ اقتصادی جنگ ہے، اور یہ جنگ ایشیا اور مغرب کے درمیان لڑی جارہی ہے۔امریکہ نے جنگ کے ذریعے یورپ، افریقہ کے اندر معیشت کے راستوں کو کنٹرول کرنے کا فیصلہ کیا ہے، دوسری طرف چین ہے، وہ جنگ کے ذریعے وسائل پر قبضہ نہیں کرتا بلکہ معاشی اشتراک کے ذریعے اپنے اقتصادی مفاد حاصل کرتا ہے۔قائد جمعیۃ کہتے ہیں کہ ہماری امریکہ سے کوئی ذاتی لڑائی نہیں، لیکن ہم اس کے منفی کردار کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے۔دلیل کی بنیاد پر اس سے مکالمہ چاہتے ہیں لیکن وہ اپنی قوت کو استعمال کرکے ہمیں غلام بنانا چاہتا ہے۔قائد جمعیۃ نے حقیقت پسندانہ سوچ اپنائی ہے۔بلاشبہ چین کے توسیع پسندانہ عزائم نہیں جیسا کہ امریکہ رکھتا ہے، چین دیگر تہذیبوں کا احترام کرتا ہے، جبکہ امریکہ اپنی تہذیب بزور مسلط کرنا چاہتا ہے، امریکہ ویورپ ہمیشہ مسلمانوں کی دل آزاری کرکے انہیں مشتعل رکھتے ہیں، جب کہ چین کا ایسا کوئی کردار سامنے نہیں آیا۔ (بشکریہ ماہنامہ ''الجمعیۃ'' راولپنڈی)

اکابر شناسی

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''اسلام صرف عبادات کا نام نہیں بلکہ وہ تمام مذہبی، تمدنی، اخلاقی اور سیاسی ضرورتوں کے متعلق ایک کامل ومکمل نظام رکھتا ہے جولوگ کہ زمانہ موجودہ کی کشمکش میں حصہ لینے سے کنارہ کشی کرتے ہیں اور صرف حجروں میں بیٹھے رہنے کو اسلامی ادائیگی کے لیے کافی سمجھتے ہیں وہ اسلام کے پاک وصاف دامن پر ایک بدنما دھبہ لگاتے ہیں اُن کے فرائض صرف نماز روزہ میں منحصر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی اسلام کی عزت برقرار رکھنے اور اسلامی شوکت کی ذمہ داری بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''مسلمانوں کی بہت سی مشکلات کا حل نیز خود اسلام کی ترقی اور اس کے بہت سے فرائض وواجبات کی ادائیگی اجتماعی قوت اور نظام صحت نظام پر موقوف ہے.....مگر آج بہت سے عاقبت نا اندیش مسلمان اس میں جدوجہد کرنے اور مسلمان کی اجتماعی قوت کو بالا کرنے سے جی چراتے ہیں یہ اُن کی سخت غلطی ہے میں ان کو متنبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنی انفرادی اصلاح کے ساتھ ساتھ اجتماعی قوت زیادہ سے زیادہ عمل میں لائیں اور ہرگز ہرگز اس میں غفلت نہ کریں ورنہ سخت خطرات سے دوچار ہوں گے''۔

حضرت حکیم الاسلام قاری محمد طیب صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''بہرحال اسلام میں مذہب اور سیاست الگ الگ نہیں نہ مذہب سے الگ سیاست کوئی چیز ہے اور نہ سیاست سے الگ مذہب کوئی چیز۔سیاست کو دین سے جب بھی علیحدہ کیا جائے گا تو نہ ہی حقیقی سیاست قائم رہے گی نہ حقیقی دین......خدام دین اس وقت تک صحیح معنیٰ میں خدمت دین نہیں کرسکتے جب تک وہ بیک دم (شریعت پر چلنے والے) متشرع (تصوف سے اپنے اخلاق درست کرنے والے) صوفی اور (سماج کی خدمت کرنے والے) سیاسی نہ ہوں......افسوس یہ ہے کہ آج یہ تینوں چیزیں الگ الگ مستقل شمار کی جارہی ہیں......جب تک قوم کا ہر ہر فرد متشرع خالص، صوفی صافی اور سیاسی مخلص نہ ہوجائے اس وقت تک قوم بحیثیت مجموعی مکمل نہیں کہلاسکتی اور اسلامی نقطہ نظر سے کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتی۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔

جہاں بینی

مسلم دنیا اور عالمی سیاست

حافظ محمد ابوبکر شیخ
ڈپٹی ایڈیٹر: ماہنامہ الجمعیہ راولپنڈی

جنگ عظیم اول کے اختتام کا انتظار کئے بغیر سلطنت عثمانیہ ترکی کے ایک بڑے حصے بلادشام کو برطانیہ اور فرانس نے باہم تقسیم کرلیا۔ان ممالک کے باہمی معاہدہ سکائی پیکاٹ (1916ء) کے تحت میسوپوٹیما (عراق) اور شام کے درمیان نئی سرحد تخلیق کی گئی۔شام فرانسیسی تسلط میں چلا گیا اور اپریل 1946ء کو آزاد اور خودمختار ہوا۔ بلادشام کے ایک حصے ''لبنان'' کو فرانس نے 1926ء میں جمہوریہ قرار دیا لیکن خود مختاری 1966ء میں دی۔ بلادشام کے تیسرے حصے میسوپوٹیمیا کو برطانیہ نے 1918ء میں عراق قرار دیا۔1921-22ء میں برطانیہ ہی کے زیراثر شریف حسین بن علی (شریف مکہ) کے بیٹے شاہ فیصل کی بادشاہت قائم کی گئی، اور اس سال نیا عراقی آئین تشکیل دیا گیا۔شاہ فیصل اور برطانیہ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے ذریعہ عراق کا دفاع، خارجہ امور اور مالیات برطانیہ کے کنٹرول میں چلے گئے۔ بلادشام کے تیسرے حصے ''فلسطین'' سے متعلق 1917ء میں برطانوی وزیر خارجہ بالغور نے یہودیوں کی تنظیم کو خط لکھا کہ برطانوی حکومت فلسطین میں یہودی ریاست کے قیام کو پسند کرتی ہے۔ یہ خط اعلان بالفور کے نام سے مشہور ہوا۔ اعلان بالفور گویا منصوبہ تھا جس کا اعلان جنگ عظیم اول میں ہوا اس کی عملی شکل جنگ عظیم دوم کے بعد برطانیہ، فرانس اور امریکہ وغیرہ کے تعاون سے اسرائیل کے نام سے ہوئی۔نومبر 1947ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ارض فلسطین کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کی سکیم منظور کی، مگر اس کے چند ماہ بعد 14 مئی 1948ء کو اسرائیل کے قیام کا اعلان کردیا گیا۔ بلادشام کا چوتھا حصہ ''اردن'' آج ایک الگ ریاست ہے۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ سلطنت عثمانیہ ترکی کے خلاف 1915-16ء کی اینگلو عرب سازش جس کے عنوانات بظاہر عرب قوم پرستی اور ''ہاشمی عرب خلافت'' تھے۔اس بغاوت کے اثرات دریائے اردن کے مشرقی حصہ پر اس طرح ظاہر ہوئے کہ یہ خطہ عرب قوم پرست قیادت کی وساطت سے برطانیہ کے بالواسطہ قبضے میں چلا گیا اور ٹرانس جارڈن کہلایا۔تیس سال بعد اس کو اس طرح آزادی ملی کہ مئی 1946ء کو عبداللہ اول بن حسین (شریف مکہ) کے دوسرے بیٹے کی بادشاہت قائم کی گئی اور تین سال بعد عبداللہ قتل ہوا تو اس کا بیٹا طلال تخت نشین ہوا۔ پورے عرب خطے پر ہاشمی عرب خلافت کے خواب دیکھنے والے خاندان کا یہ فرد برطانوی ریشہ دوانیوں اور وعدہ خلافیوں کا شکار ذہنی مریض بن چکا تھا۔طلال ایک سال بعد اپنے اٹھارہ سالہ بیٹے حسین کے حق میں دست بردار ہوگیا، اردن کا یہ شاہ حسین شریف مکہ کا پڑپوتا تھا۔ بلادشام کا پانچواں حصہ کویت (قدہ) میسوپوٹیما (عراق) کا ایک ضلع ہوا کرتا تھا۔1899ء میں کویتی حاکم شیخ مبارک نے برطانیہ سے ایک معاہدہ کیا، اس معاہدے کو سلطنت عثمانیہ ترکی سے کویت کی علیحدگی کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔اس معاہدے کے بعد بظاہر شیخ مبارک کویت کا حاکم رہا مگر عملاً قبضہ برطانیہ ہی کا ہوگیا تھا۔1913ء میں عثمانی ترکوں اور برطانیہ نے بھی ایک معاہدہ کویت سے متعلق کیا، اس اینگلو ترک معاہدے کی رو سے شیخ مبارک الصباح کو کویت کا خودمختار حاکم تسلیم کیا گیا۔حسب روایت برطانیہ کی عہد شکنیوں کا سلسلہ کویت میں بھی دراز ہوا۔ چنانچہ جنگ عظیم اول میں برطانیہ نے کویت کو اپنے ماتحت ''آزاد بادشاہی نظام والا ملک'' قرار دیا۔

عراق نے 1952ء میں کویت (قدہ) پر اپنا حق جتایا جسے برطانیہ نے مسترد کردیا۔عراق نے 1973ء میں کویتی سرحدی علاقے السمیۃ پر قبضہ کیا سعودی عرب کی پندرہ ہزار افواج نے کویت کو السمیۃ کا قبضہ واپس دلایا۔ 2 اگست 1990ء کو ایک بار پھر اپنا تاریخی حق جتاتے ہوئے عراق نے کویت پر حملہ کیا۔اس بار عراقی افواج کویت سٹی پر قابض ہوگیا عراقی صدر صدام حسین نے کویت کو عراقی صوبہ قرار دے کر وہاں اپنی مرضی کی صوبائی قیادت بٹھادی۔امریکی قیادت میں کثیر الملکی افواج نے جدید ترین جنگی سازوسامان اور بڑی فوجی قوت سے تر تالیس دن کی شدید بمباری کے بعد عراق کو پسپائی پر مجبور کردیا۔صدام حسین نے امریکی اتحاد کے حملے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا: ''ام الحروب (جنگوں کی ماں......) کا آغاز ہوگیا ہے۔اس واقعہ کے بعد امریکہ نے عراق پر ہمیشہ کیلئے نظریں گاڑ لیں۔امریکی مختلف بہانوں سے عراق اور اس کی قیادت کو زچ کرنے لگے۔اس کی وجہ عام فہم ہے کہ دنیا کے کل پیٹرولیم ذخیرہ کا بیس فیصد محض دوممالک کویت اور عراق کے پاس ہیں۔آخرکار 2003ء میں امریکہ نے کیمیائی ہتھیاروں کی موجودگی کا بہانہ بنا کر عراق پر ہر طرف سے جنگ مسلط کردی۔شدید ترین بمباری اور بھاری جنگی مشینری کے بے دریغ استعمال سے عراق کو تہس نہس کرتے ہوئے اس پر مکمل قبضہ کیا گیا۔لوئس پال بریمر کو عبوری سربراہ مقرر کیا گیا۔لوئس پال تقریباً ایک سال کے اندر من پسند عراقی حکومت بنا کر چلا گیا۔گزشتہ تیرہ سال سے عراق کی صورت حال تقریباً ویسی ہی ہے، جیسی کہ 1918-22ء کے درمیان شاہ فیصل بن حسین (شریف مکہ) کے عہد میں تھی۔تب عراق برطانیہ کے ماتحت ''آزاد'' تھا اور آج کل امریکہ کے ماتحت ''آزاد'' ہے۔گزشتہ تین سال کے دوران ''دولت اسلامیہ عراق، شام'' کے نام سے (داعش) تنظیم کے بہت چرچے ہیں۔جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے یہ تنظیم سکائی پیکاٹ معاہدے (1916ء) کے مطابق بلادشام کے دو ملکوں شام اور عراق کے درمیانی سرحد کو نہیں مانتی اور شام عراق ادغام پر کسی ایسی ہی خلافت کے قیام کی دعویدار ہے جیسی کہ برطانوی چکمے میں آکر عرب ہاشمی خلافت جزیرہ نما عرب پر ہے جیسی کہ برطانوی چکمے میں آکر ''عرب ہاشمی خلافت'' جزیرہ نما عرب پر قائم کرنے کا خواب حسین بن علی (شریف مکہ) نے سوسال قبل دیکھا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ عراق، شام ادغام اور اس پر خلافت کے نعروں سے ممکنہ طور پر صورت حال کس طرف جارہی ہے؟ اس طرف جیسا کہ قذافی شہید کی حکومت کے خاتمے کے بعد لیبیا میں ہوچکی ہے، وہاں مختلف عسکری تنظیموں نے متحد ہوکر صلیبی جہازوں کی بمباری کے تعاون سے پیش قدمی کی تھی، داعش کے ساتھ بھی دیگر تنظیمیں ہیں، مثلاً النصرہ فرنٹ، الجیش السوری الحر، اسلامک فرنٹ وغیرہ۔لیبیائی تجربہ کی روشنی میں محسوس یہ ہوتا ہے کہ جب تک بشارالاسد کی حکومت موجود ہے یہ تنظیمیں متحد ہیں، جیسے ہی شام کی موجودہ حکومت منظر سے ہٹی باہمی لڑائیاں شروع ہوجائیں گی۔دوسرا سوال یہ ہے کہ ان تنظیموں کی کاروائیاں جہاں آج کل زوروں پر ہیں، اسرائیل تو وہاں سے محض ایک سومیل (تقریباً) کے فاصلے پر ہے۔اسرائیل سے متعلق داعش کا موقف غیرواضح ہے، اس کا صاف مطلب ہے کہ داعش وغیرہ تنظیمیں مسلم ممالک اور مسلم شناخت کے خطوں میں عالمی طاقتوں کا ہراول دستہ ثابت ہوسکتی ہیں جو موقع فراہم کرتا ہے کہ کہیں ان کی آڑ میں روس مداخلت کرلے جیسا کہ شام میں ہورہا ہے، کہیں امریکہ یا اس کے اتحادی فرانس، برطانیہ وغیرہ مداخلت کریں جیسا کہ لیبیا میں ہوچکا ہے۔ان مداخلتوں سے سامراجی ممالک عوام کے تضادات کو ابھار کر انہیں باہم دست وگریباں کرتے ہیں، خود ان ممالک کے گراں قدر اثاثوں کی لوٹ مار کرتے ہیں جیسا کہ عراق وغیرہ میں گزشتہ چودہ پندرہ سال سے ہورہا ہے۔اس پر مستزاد یہ کہ بدامنی کا شکار بن کر نقل مکانی کرنے والوں کو پڑوسی ممالک میں گھسنے پر مجبور کرتے ہیں اور جب یہ لوگ پڑوسی ممالک میں جاتے ہیں تو (سامراجی ایجنٹ) ان آئی ڈی پیز یا مہاجروں کے روپ میں اپنے آلہ کاران ممالک میں داخل کردیتے ہیں۔یوں یہ ہراول دستے ایجنٹی اور آلہ کاری کیلئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔انہی کے ساتھ تشدد اور بدامنی کے سلسلے وہاں وہاں منتقل ہوتے ہیں جہاں جہاں صلیبی سامراجی دارالحکومت کو ان کی منتقلی مطلوب ہوتی ہے۔مثلاً افغانستان سے بدامنی اور قتل وغارت پاکستان منتقل ہوئی۔عراق سے سعودی عرب اور شام میں آگ اور کا کھیل پہنچا۔حالیہ چند سالوں سے شام سے آگے ترکی میں یہ کاروائیاں منتقل ہورہی ہیں۔

یہ خبریں ڈھکی چھپی نہیں کہ داعش وغیرہ ترکی سے اپنے ہمدردوں کو اسلحہ پہنچاتی ہیں۔(بقیہ ص: ۴)

افکار

حضرت شاہ ولی اللہ کے نظریات

"علماء ہند کے شاندار ماضی کا ایک ورق"

از: مولانا محمد میاں رحمہ اللہ
ترتیب و تلخیص:
محمد عرفان شجاع

شاہ ولی اللہؒ:

اٹھارہویں صدی کا آغاز تھا کہ اس جلیل القدر فاضل، آزاد خیال مفکر اور انقلاب آفرین مصلح کی کتاب زندگی کا افتتاح ہوا۔ اور ساتویں دھائی کے پورے دو سال بھی گزرنے نہیں پائے تھے کہ ۱۱۷۶ھ/ ۱۷۶۲ء میں اُس نے صحیفۂ حیات کا آخری ورق پلٹ دیا۔

اٹھارہویں صدی پر ایک نظر

یہ وہ انقلاب آفریں اور ہنگامہ خیز صدی تھی جس میں ایک شاہنشاہیت کا آفتاب ڈھلتے ڈھلتے غروب کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور ایک دوسری شاہنشاہیت کی صبح کاذب ہندوستان کے مشرق میں صبح صادق بنتی جا رہی تھی۔ اس صدی کا آغاز ہوا تو قندھار سے آسام تک، نیپال اور تبت سے مالا بار و کھمبات تک پورے ملک کا سیاسی مرکز ایک تھا۔ مگر ابھی پہلی دھائی ختم نہیں ہوئی تھی کہ فروری ۱۷۰۷ء میں اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد وہ قیامت برپا ہوئی کہ شیرازۂ ملک کا ایک ایک ورق جدا ہو گیا اور یورپ کی وہی سفید فام طاقتیں جن پر عالمگیر کے دادا پر دادا نے مہربانیوں اور شاہانہ عنایات کی بارش کی تھی، جن کو عالمگیر کے باپ (شاہجہاں) نے شکنجۂ تادیب میں کسا تھا، جن کو عالمگیر نے پہلے ملک بدر کیا تھا پھر معاف کر کے تجارت کی اجازت دی تھی، ابھی سو سال پورے نہیں ہوئے تھے کہ عالمگیر کی راجدھانی پر اس کا تسلط، اور عالمگیر کا پوتا شاہ عالم اس کا وظیفہ خوار تھا۔ دوسرے الفاظ میں اس صدی کے مدوجزر کا خلاصہ یہ ہے کہ سلطان اورنگ زیب عالمگیر کی شاہنشاہانہ عظمت سے اس کا آغاز ہوا۔ اور خاتمہ اُس فداء ملک وملت کی شہادت پر ہوا جس کو دنیا سلطان ٹیپو کے نام سے پہچانتی ہے۔ جس کے خون شہادت میں لتھڑے ہوئے جنازہ کو دیکھ کر انگریز فاتح کی زبان بے ساختہ پکار اُٹھی تھی:

"آج ہندوستان ہمارا ہے"

اس صدی کے قیامت خیز ہنگاموں کا خلاصہ یہ ہے:

(۱) مرکزی حکومت کے ارکان میں ایرانی، تورانی یا شیعہ سنی اختلاف و کش مکش کا مرض جو عالمگیر کی زندگی تک دبا رہا تھا، وفات کے بعد پوری شدت سے اُبھرا، اور وہ خانہ جنگی شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں صرف پچاس سال کے عرصہ میں (۱۷۰۷ء تا ۱۷۵۷ء) تخت دہلی پر دس تاجدار بٹھائے گئے اور اُتارے گئے۔ اُن میں دس چار اپنی موت سے مرے۔ باقی کے سر قلم کیے گئے یا تخت سے اُتار کر آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔

(۲) صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے، اور مغل شاہنشاہ ایک دعا گو "مرشد" بن کر رہ گیا۔

(۳) جنوبی ہند میں مرہٹوں کی طاقت ایک مستقل طاقت بن گئی۔

(۴) دہلی کے شمال مشرق میں روہیلوں کی حکومت قائم ہو گئی اور اس کے مقابل اودھ کی وزارت نے شاہنشاہیت اختیار کر لی۔

(۵) دہلی کے جنوب مغرب میں جاٹوں کی طاقت اُبھری۔ اور

(۶) شمال مغربی میں خالصہ (جو اب تک مذہبی فرقہ رہا تھا) ایک مستقبل سیاسی طاقت بن گیا۔

شاہ ولی اللہؒ: تشخیص مرض اور فکر علاج

یہ تمام تباہ کن خونیں ڈرامے، شاہ ولی اللہ صاحب کی زندگی میں اُن کی چشم بینا کے سامنے ہو رہے تھے۔ ایک طرف آپ کے قلب حساس میں بربادئ وطن کا درد تھا۔ دوسری طرف آپ کا مغز بیدار، اسباب مرض کی تلاش اور فکر علاج میں مشغول تھا۔ اسی اضطراب اور بے چینی میں آپ نے اصلاحی جدوجہد شروع کی جس کی شدت سے مخالفت کی گئی، یہاں تک کہ ایک مرتبہ مسجد فتح پوری سے نکلتے ہوئے آپ پر قاتلانہ حملہ بھی کیا گیا۔

اسی ادھیڑ بن میں آپ نے ۱۱۴۳ھ/ ۱۷۲۹ء میں حجاز شریف کا سفر اختیار کیا وہاں دو سال قیام کر کے علمی اور روحانی مشاغل کے ساتھ ساتھ بڑا کام یہ کیا کہ یورپ اور ایشیا کے زائرین سے ان ممالک کے متعلق پوری واقفیت حاصل کی۔ ترکی حکومت کو اگرچہ سماجی خرابیوں کا گھن لگ چکا تھا مگر پھر بھی وہ اس زمانہ میں ایشیا کی سب سے بڑی حکومت تھی۔ تمام مشرق وسطیٰ پر اس کے اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا۔ بحر عرب میں عدن تک اس کا قبضہ تھا اور یورپ و افریقہ کے بھی بہت سے حصے اس کے زیر اقتدار تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس سب سے بڑی حکومت کے اندرونی حالات کا بھی گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ ان تمام ممالک کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد آپ کے گہرے سوچ بچار اور اعلیٰ تدبر نے فیصلہ کیا کہ جو کچھ سماجی، معاشی یا اقتصادی تباہیاں اس وقت موجود ہیں اُن کا اصل سبب "ملوکیت" اور "شاہنشاہیت" ہے۔

اس سفر حجاز میں آپ کے ضمیر کی آواز نے یہ فیصلہ بھی سنا دیا کہ ان تباہیوں اور بربادیوں کا واحد علاج "فک کا نظام" ہے یعنی ایسا ہمہ گیر اور مکمل انقلاب جو سماج کے معاشی، سیاسی، اقتصادی، غرض ہر ایک ڈھانچہ کو بدل ڈالے۔

شاہ ولی اللہؒ کے اصلاحی نظریات

ہندوستان اس خوش قسمتی پر جس قدر فخر کرے کم ہے کہ اس دور میں کہ ابھی انقلاب فرانس ۱۷۸۹ء جس کو انقلاب پسندانِ عالم کے لیے نشانِ راہ کہا جاتا ہے نصف صدی بعد آنے والا تھا۔ اور کمیونزم کے معلوم اول اول کارل مارکس اور اس کے نفس ناطقہ اور رفیق عزیز "اینگلس" کی پیدائش میں پوری ایک صدی باقی تھی اور اس سے تقریباً چالیس ۴۰ سال پہلے کہ یورپ میں مشینوں اور کلوں کا آغاز ہوا، ہندوستان کے ایک سپوت نے اقتصادیات کے بارہ میں طے کیا کہ:

شاہ ولی اللہؒ کے اقتصادی اصول:

(۱) دولت کی اصل بنیاد محنت ہے۔ مزدور اور کاشتکار قوت کاسبہ ہیں۔ باہمی تعاون مدنیت (شہریت) کی روح رواں ہے۔ جب تک کوئی شخص ملک اور قوم کے لیے کام نہ کرے، ملک کی دولت میں اُس کا کوئی حصہ نہیں۔

(۲) جوا، سٹہ اور عیاشی کے اڈے ختم کیے جائیں جن کی موجودگی میں تقسیم دولت کا صحیح نظام قائم نہیں ہو سکتا، اور بغیر اس کے کہ قوم اور ملک کی دولت میں اضافہ ہو دولت بہت سی جیبوں سے نکل کر ایک طرف سمٹ آتی ہے۔

(۳) مزدور، کاشتکار اور جو لوگ ملک اور قوم کے لیے دماغی کام کریں دولت کے اصل مستحق ہیں۔ اُن کی ترقی اور خوش حالی ملک اور قوم کی ترقی اور خوش حالی ہے۔ جو نظام ان قوتوں کو دبائے وہ ملک کے لیے خطرہ ہے، اُس کو ختم ہو جانا چاہیے۔

(۴) جو سماج محنت کی صحیح قیمت ادا نہ کرے۔ مزدوروں اور کاشتکاروں پر بھاری ٹیکس لگائے، قوم کا دشمن ہے، اُس کا ختم ہو جانا چاہیے۔

(۵) ضرورت مند مزدور کی رضامندی قابل اعتبار نہیں۔ جب تک اس کی محنت کی وہ قیمت ادا نہ کی جائے جو امداد باہمی کے اصول پر لازم ہوتی ہے۔

(۶) جو پیداوار یا آمدنی تعاون باہمی کے اُصول پر نہ ہو وہ خلاف قانون ہے۔

(۷) کام کے اوقات محدود کیے جائیں۔ مزدوروں کو اتنا وقت ضرور ملنا چاہیے کہ وہ اخلاقی اور روحانی اصلاح کر سکیں اور اُن کے اندر مستقبل کے متعلق غور و فکر کی صلاحیت پیدا ہو سکے۔

(۸) تعاون باہمی کا بہت بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ لہٰذا اس کو تعاون کے اصول پر ہی جاری رہنا چاہیے۔

پس جس طرح تاجروں کے لیے جائز نہیں کہ وہ بلیک مارکیٹ یا غلط قسم کے "کمپی ٹیشن" سے روح تعاون کو

نقصان پہنچائیں، ایسے ہی حکومت کے لیے درست نہیں کہ بھاری ٹیکس لگا کر تجارت کے فروغ و ترقی میں رکاوٹ پیدا کرے یا رخنہ ڈالے۔

(۹) وہ کاروبار جو دولت کی گردش کو کسی خاص طبقہ میں منحصر کردے، ملک کے لیے تباہ کن ہے۔

(۱۰) وہ شاہانہ نظام زندگی جس میں چند اشخاص یا چند خاندانوں کو عیش و عشرت کے سبب سے دولت کی صحیح تقسیم میں خلل واقع ہو، اس کا مستحق ہے کہ اس کو جلد از جلد ختم کر کے عوام کی مصیبت ختم کی جائے، اور اُن کو مساویانہ نظام زندگی کا موقع دیا جائے۔

سیاست اور نظام حکومت کے بنیادی اصول:

(۱۱) زمین کا مالک حقیقی اللہ (اور ظاہری نظام کے لحاظ سے اسٹیٹ) ہے۔ باشندگان ملک کی حیثیت وہ ہے جو کسی مسافر خانہ میں ٹھہرنے والوں کی۔ ملکیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے حق انتفاع میں دوسرے کی دخل اندازی قانوناً ممنوع ہو۔

(۱۲) سارے انسان برابر ہیں۔ کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ اپنے آپ کو مالک ملک الناس، مالک قوم یا انسانوں کی گردنوں کا مالک تصور کرے۔ نہ کسی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی صاحب اقتدار کے لیے ایسے الفاظ استعمال کرے۔

(۱۳) اسٹیٹ کے سربراہ کار کی وہ حیثیت ہے جو کسی وقف کے متولی کی۔ وقف کا متولی اگر ضرورت مند ہو تو اتنا وظیفہ لے سکتا ہے کہ عام باشندۂ ملک کی طرح زندگی گزار سکے۔

بنیادی حقوق:

حجۃ اللہ البالغہ اور البدور البازغۃ وغیرہ تصانیف میں ارتفاقات (مفادات عامہ) کے عنوان سے بہت مفصل بحث کی ہے ان کا حاصل یہ ہے کہ:

(۱۴) روٹی، کپڑا، مکان اور ایسی استطاعت کہ نکاح کر سکے اور بچوں کی تعلیم و تربیت کر سکے۔ بلالحاظ مذہب و نسل ہر ایک انسان کا پیدائشی حق ہے۔

(۱۵) اسی طرح مذہب، نسل یا رنگ کے کسی تفاوت کے بغیر عام باشندگان ملک کے معاملات میں یکسانیت کے ساتھ عدم و انصاف، اُن کے جان و مال کی حفاظت، اُن کی عزت و ناموس کی حفاظت، حق ملکیت میں آزادی، حقوق شہریت میں یکسانیت ہر باشندۂ ملک کا بنیادی حق ہے۔

(۱۶) زبان اور تہذیب کو زندہ رکھنا ہر ایک فرقہ کا بنیادی حق ہے۔

بین الاقوامی تحفظات:

(۱۷) ان حقوق کو حاصل کرنے کی شکل یہ ہے کہ خود مختار علاقے بنائے جائیں۔ یہ خود مختار اکائیاں اپنے معاملات میں آزاد ہوں گی۔ ہر ایک یونٹ میں اتنی طاقت ضرور ہونی چاہیے کہ اپنے جیسے یونٹ کے اقدام کا مقابلہ کر سکے۔ یہ تمام اکائیاں ایک ایسے بین الاقوامی نظام (بلاک) میں منسلک ہوں جو فوجی طاقت کے لحاظ سے اقتدار اعلیٰ کا مالک ہو۔ اُس کو یہ حق نہیں ہوگا کہ کسی مخصوص مذہب یا مخصوص تہذیب کو کسی یونٹ پر لاد سکے۔ البتہ اس کا یہ فرض ضرور ہوگا کہ کسی قوم یا یونٹ کو یہ موقع نہ دے کہ کسی دوسری قوم کے مذہب یا تہذیب پر حملہ کر سکے۔

مذہبیات:

الف: دین اور سچائی کی اصل بنیاد ایک ہے۔ اس کے پیش کرنے والے ایک سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔

ب: داعیان صداقت ہر ملک اور قوم میں گزرے ہیں۔ اُن سب کا احترام ضروری ہے۔

ج: سچائی اور دین کے بنیادی اصول تمام فرقوں میں تقریباً تسلیم شدہ ہیں۔ مثلاً اپنے پروردگار کی عبادت، اس کے لیے نذر و نیاز، صدقہ و خیرات، روزہ وغیرہ یہ سب کام سب کے نزدیک اچھے ہیں۔ البتہ عملی صورتوں میں اختلاف ہے۔

د: ساری مہذب دنیا کے سماجی اصول، اور اُن کا منشا و مقصد ایک ہے مثلاً ہر ایک مذہب اور فرقہ جنسی انارکی کو ناپسند اور اخلاقی جرم قرار دیتا ہے۔ جنسی تعلقات کے لیے مرد اور عورت میں ایک معاہدہ، ہر ایک فرقہ میں ضروری ہے البتہ معاہدہ کی صورتیں مختلف ہیں۔ ایسے ہی ہر ایک فرقہ اپنے مردہ کو نظروں سے غائب کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔ اختلاف اس میں ہے کہ زمین میں دفن کر کے نظروں سے اوجھل کیا جائے یا جلا کر۔

جہاد:

ایک مقدس فرض ہے۔ مگر اس کے معنی یہ ہیں کہ مقدس اصول کے لیے انسان اپنے اندر جذبۂ فدائیت پیدا کرے، یہاں تک کہ وہ اپنی ہستی ان اصول کے لیے فنا کر دے۔

اقتصادی حالات کا اثر روحانی ترقی پر:

ہندوستان اپنی اس خصوصیت پر ہمیشہ فخر کرتا رہا ہے کہ اس کی تہذیب و سیاست کبھی مذہب اور خدا پرستی سے بیگانہ نہیں ہوئی۔

ہندوستان کا بلند مرتبہ سپوت (شاہ ولی اللہ) جس کو تاریخ نے آج تک بھلائے رکھا ہے، اس خصوصیت کا آئینہ دار ہے۔ بے شک وہ عالم دین اور روحانیت اور فلسفۂ اخلاق کا بہترین ماہر ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جاننے والے اس کو "شاہ" کا لقب دیتے ہیں، جو روحانی بزرگوں کو از راہِ عقیدت دیا جاتا ہے۔ لیکن اس عالم دین اور روحانی پیشوا کا نظریہ یہ ہے کہ وہ تباہی اور بدحالی جو مذہبی نقطۂ نظر سے سوسائٹی میں پائی جاتی ہے اس کا بڑا سبب یہی اقتصادی بحران ہے جس نے سرزمین ہند کو پرشور بنا رکھا ہے۔ اس مذہبی رہنما کا یہ فیصلہ ہندوستان کے خاص حالات کے ساتھ ہی مخصوص نہیں ہے بلکہ اُن کا نظریہ یہ ہے کہ عالم انسانیت میں ہمیشہ یہ ہی ہوتا رہا ہے کہ اقتصادی عدم توازن نے مذہب کے سربفلک قلعوں کو مسمار کیا ہے۔ اس لیے سوسائٹی کو اقتصادی اصلاح، مذہبی اور اخلاقی اصلاح اور روحانی کمالات کے لیے سب سے پہلی سیڑھی ہے۔ انتہا یہ کہ یہ مذہبی بادشاہ (شاہ ولی اللہؒ) سوسائٹی کی اقتصادی اصلاح کو انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اہم جز و قرار دیتا ہے۔

چنانچہ اپنی مشہور تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ذرائع معیشت پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے تحریر کرتا ہے:

"محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت دنیا کی حالت یہ تھی کہ عیش و عشرت اور حد سے بڑھے ہوئے شاہانہ تکلفات کا مرض، (جس نے ملک اور قوم کو اقتصادی عدم توازن کی تباہیوں میں مبتلا کر رکھا تھا) ایران اور روما وغیرہ میں وبا کی طرح پھیلا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کے دل میں القاء کیا کہ وہ اس مرض کا ایسا علاج کرے کہ نہ صرف مرض ختم ہو بلکہ زہریلا مادہ بھی فنا ہو جائے۔ جس کی وجہ سے یہ مرض پیدا ہوا ہے۔ پس آنحضرت ﷺ نے ان اسباب و وجوہات پر غور فرمایا جن سے اس مرض کے جراثیم نشو و نما پا رہے تھے۔ پھر ایک ایک مرض کی تشخیص کر کے ان کی ممانعت فرمادی"۔ (ابواب ابتغاء الرزق ص: ۹۸۔ ج: ۲)

یہی مضمون ایک دوسرے موقع پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ وہ اگرچہ کسی قدر طویل ہے مگر موضوع کی اہمیت اس طوالت کو جائز قرار دیتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ آپ اٹھارہویں صدی کے مسلمان عالم کو دیکھیں گے کہ وہ بیسویں صدی کے کمیونسٹ کی زبان بول رہا ہے۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ آنحضرت ﷺ کی بعثت کے وقت (یعنی ساتویں صدی عیسوی میں) ایران اور روما کی سلطنتیں عروج پر تھیں۔ مگر اقتصادی عدم تعاون نے ان کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔ حضرت شاہ صاحب انہیں دو سلطنتوں کی تاریخی مثال سے اقتصادی خرابیوں کا تجزیہ کرتے ہیں اور مشاہدہ کے لیے اپنے زمانہ کے بادشاہوں کی مثال پیش کرتے ہیں۔

ہندوستان کی اقتصادی تباہ حالی اور اس کے وجوہات شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

"ایران اور روما کی سابق تاریخ ہمارے لیے روشن مثال ہے، اور جو کچھ تم اپنے ملک میں دیکھ رہے ہو، اس سے ایران اور روما کی حالت کا اندازہ کر لو"۔ دولت و ثروت کے ساتھ فلسفہ اور سائنس کی تحقیقات نے ایجادات کا راستہ کھولا۔ نئی نئی صنعتیں رونما ہوئیں اور ملک اپنے اس دور میں تمدن کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ پر پہنچ گیا لیکن بدقسمتی سے اہل ثروت اور حکمران طبقہ میں عیش، فیشن اور وجاہت یا اقتدار پرستی اور ایک دوسرے کے مقابلہ میں تفاخر (بڑھ چڑھ کر رہنے) کا مرض پیدا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اس پر فخر ہونے لگا کہ کس کا تاج زیادہ قیمتی ہے اور کس کے سر پر سلطنت میں زیادہ جواہر ٹکے ہوئے ہیں۔

ارباب حکومت کے اس ٹھاٹھ نے سوسائٹی کا مزاج بگاڑ دیا۔ نئے نئے فیشن، امیرانہ شان و شوکت اور

ستاہانہ تکلفات نبھانے کے لیے ہر ایک صاحب اقتدار اپنے ماتحت کو لوٹنے لگا۔ زمیندار اور جاگیردار کاشتکاروں کا خون چوسنے لگے، اور جو مزدوروں پر اختیار رکھتے تھے انہوں نے غریب مزدوروں کو نوچنا شروع کر دیا۔ اب اس بااقتدار طبقہ کی تمام عملی اور فکری طاقتیں ترقی ملک و دولت کے بجائے عیش و عشرت، شاہانہ تکلفات، نفع اندوزی، اور استحصال بالجبر پر صرف ہونے لگیں، اور ماتحت طبقہ اتنا گر گیا کہ اس کی زندگی کھیت جوتنے والے بیلوں اور بوجھ اٹھانے والے گدھوں گھوڑوں کی مانند ہوگئی۔ زرکشی اور زراندوزی کے لیے نئے نئے قانون ایجاد ہوئے۔

مزدور اور کسان طبقہ اگر ان سے سرتابی کرتا تو مجرم بن کر طرح طرح کی سزاؤں میں مبتلا ہوتا۔ اور اگر سزاؤں سے بچنا چاہتا تو لامحالہ باربردار گھوڑوں اور گدھوں کی زندگی پر مجبور ہوتا یہ دونوں طبقے اپنے اپنے حالات میں ایسے غرق ہو گئے کہ پیدائش انسان کا حقیقی مقصد کسی کے سامنے بھی نہیں رہا۔ ایک طبقہ کو حد سے بڑھے ہوئے عیش اور دولت کی چمک دمک نے اندھا کر دیا اور دوسرا طبقہ پیٹ کی فکر میں ایسا سرگرداں ہوا کہ فکر مستقبل کی صلاحیت بھی ختم کر بیٹھا۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ تمام دولت سمٹ کر چند افراد کے ساتھ مخصوص ہوگئی، جن کا سربراہ بادشاہ تھا۔

اقتصادی عدم توازن اور طبقۂ اعلیٰ کی شان و شوکت اور عیش پرستی نے ایک تیسرا طبقہ پیدا کر دیا۔ یہ تن آسان، آرام طلب سرکاری پرست خوشامدیوں کا طبقہ تھا جو بادشاہ اور شاہ پرستوں کے گرد جمع ہو گیا تھا اور مختلف عنوانات سے رقمیں وصول کرتا رہتا تھا ان میں بہت سے صاحب فن و اہل علم بھی ہوتے تھے۔ وہ فن اور علم کے نام پر روپیہ وصول کرتے تھے مگر اُن کا مطمع نظر ملک کی خدمت نہیں بلکہ اپنی ذاتی اغراض، ذاتی جاہ و جلال اور ذاتی اقتدار، اُن کی جدوجہد کا نصب العین ہوتا تھا۔ کوئی اس نام سے روپیہ وصول کرتا تھا کہ وہ فن سپہ گری کا ماہر ہے۔ بہترین جرنیل یا کمانڈر ہے۔ کوئی اپنے علم و ہنر اور اپنی سیاست دانی کے نام پر روپیہ وصول کرتا تھا۔ خانقاہ نشینوں کی ایک جماعت تھی جو تقدس کے نام پر وظیفے حاصل کرتی تھی۔ ایک جماعت فنون لطیفہ و ادب و شاعری کے نام پر رقمیں اینٹھتی تھی کہ شان خسروانہ یہی ہے کہ فنون لطیفہ کے ماہرین کی قدر کرتے ہیں۔

بادشاہ یا امراء کو خوش کرنا، خوش گپیوں سے گرمیٔ مجلس پیدا کرنا ایک فن قرار دے دیا گیا تھا اور اس فن کے ماہرین طرح طرح کے ڈھونگ رچا کر روپیہ وصول کرنے لگے تھے۔ شاہانہ آداب، درباری آداب ایک خاص فن بن گیا۔ اور ایک گروہ اسی طرح اس نام پر رقمیں وصول کرنے لگا۔ یہ تمام جماعتیں جن کو لازمۂ تمدن مان لیا گیا تھا، درحقیقت مفت خوروں کے گروہ تھے جو ملک اور قوم کی خدمت کے بجائے اپنی تمام صلاحیتیں مٹھی بھر شاہ پرستوں کی اغراض اور اُن کی خوشنودی کے لیے صرف کرتے تھے اور ملک اور ملک کے مزدوروں اور کسانوں پر بار بنتے جا رہے تھے۔ اس طرح خدا کی تمام مخلوق دن بدن افلاس، فلاکت، اور تباہ حالی میں مبتلا ہو کر روحانی فلاح و بہبود سے بھی محروم ہو رہی تھی۔ یہاں تک کہ پورے ملک میں بھی کوئی شخص ایسا نہیں ملتا تھا جس کو عاقبت کی فکر ہو۔ اللہ تعالیٰ جو تمام مخلوق کا پروردگار ہے، اُس نے رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا تاکہ وہ روحانی اصلاحات کے ساتھ اقتصادی تباہ حالی بھی ختم فرمائیں اور معیشت کے ایسے اصول تلقین فرمائیں جن سے اقتصادی امراض کے مسموم جراثیم کا قلع قمع ہو جائے‘‘۔

حضرت شاہ صاحبؒ اس مفہوم کو ذہن نشین کرانے کے لیے کہ اقتصادی حالات کا روحانی اصلاحات پر کیا اثر پڑتا ہے، ایک مثال پیش فرماتے ہیں۔ اس مثال سے یہ بھی اندازہ ہو جائے گا کہ حضرت شاہ صاحب جس حکومت کی حمایت کر سکتے ہیں، اس کا نقشہ کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

’’ایک ایسی قوم فرض کرو جس میں ملوکیت نہ ہو۔ شاہانہ شان و شوکت اور عیش پرستی کے لوازمات سے محفوظ ہو۔ ہر شخص اقتصادی طور پر آزاد ہو اور ٹیکسوں کے بوجھ سے اس کی کمر دوہری نہ ہو گئی ہو۔ ایسی قوم کو یہ فراغت میسر ہو گی کہ وہ دین و ملت کے کام انجام دے سکے۔ اخلاقی اور روحانی ترقی حاصل کر سکے۔ لیکن اگر اس قوم کی گردن پر ملوکیت، شاہ پرستی اور سرمایہ کا بھوت سوار ہو جائے، تو اس کے ہوش و حواس گم ہو جائیں گے۔ اور وہ انسانی شرف و عظمت سے گر کر چوپاؤں کی زندگی پر مجبور ہو جائے گی جن کو رات دن پیٹ کا فکر رہتا ہے اور پھر بھی یہ جہنم بھرنے نہیں پاتا۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول باب اقامۃ الارتفاقات واصلاح الرسوم)

عوام کی خوش حالی کا بنیادی اصول اقتصادی بدحالی کے انسداد کی پہلی شرط:

خوش حالی بہت اچھی چیز ہے۔ وہ انقلابات جو گزشتہ ڈیڑھ صدی میں دنیا کے سیاسی پلیٹ فارم پر رونما ہوئے، اُن کا مقصود یہ ہی ظاہر کیا گیا کہ ملک کے تمام باشندے آسودہ اور فارغ البال ہوں۔ عوام کی خوش حالی کے لیے بہت سے پروگرام بنائے گئے اور اُن کو تجربوں کی آماج گاہ میں لایا گیا۔ مگر کیا یہ مقصد پورا ہوا؟ بے شک انقلاب کے ان طوفانوں میں انسانی خون کی بے شمار ندیاں بہائی گئیں۔ مگر کیا گوہر مقصود کسی قسم کے ہاتھ لگا؟ اور کیا وہ فارغ البالی اور جمہور کا وہ اطمینان کلی جس کے لیے یہ کھیل کھیلے گئے تھے حاصل ہوا؟ ممکن ہے کہ کمیونزم کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ مگر کیا کمیونزم خود بھی اپنی اس سیر چشمی کا معترف ہے کہ وہ غیر کمیونسٹوں کے لیے بھی اطمینان اور فارغ البالی کی بخشش کر سکا؟ شاہ صاحب نظریات اگر سامنے رکھے جائیں تو اس ناکامی کا سبب ایک خاص نکتہ ہے جو انیسویں اور بیسویں صدی کی تمام انقلابی تحریکات میں نظرانداز ہوتا رہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان انقلابات میں ملوکیت اور سرمایہ داری بے شک ختم کی گئی لیکن وہ چیزیں جو انسانی دل و دماغ میں شاہ پرستی اور سرمایہ داری کے بیج بوتی ہیں، ختم نہیں کی گئیں۔ بلکہ بسا اوقات خود انقلابی رہنماؤں کا طرز عمل اس تخم کی آباری کرتا رہا۔ فکر و عمل کے اس تضاد کا یہ نتیجہ ہے کہ سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے ختم ہونے پر بھی گوہر اطمینان مفقود اور جنس اضطراب کی فراوانی روز افزوں ہے۔

مذہب کی روشنی میں شاہ صاحبؒ کی رائے یہ ہے کہ سونے اور چاندی کے انباروں سے زیادہ خطرناک وہ طرز معاشرت ہے جو امیر و غریب میں امتیاز قائم کر کے غریب کے دل میں سرمایہ داری کی ہوس اور شاہ پرستی کا شوق پیدا کرتا ہے۔ سونے چاندی کے برتن، زربفت و زردوز، زرق برق ریشمی لباس، وہ فیشن اور وہ تکلفات جو دولت مندوں کے دماغوں میں کبر و غرور اور تصور برتری پیدا کرتے ہیں، اور ناداروں کے دلوں میں حرص و طمع کا وہ اضطراب پیدا کرتے ہیں، جو اُن کو زیادہ ستانی رشوت، چوری، خیانت، استحصال بالجبر اور عصمت فروشی وغیرہ پر آمادہ کر دیتا ہے۔ غرض سماجی زندگی کے بیش قیمت تکلفات سرمایہ داری اور شاہ پرستی کے وہ زہریلے جراثیم ہیں کہ جب تک قانون ان کی اجازت دیتا رہے گا سرمایہ داری کی جڑیں مضبوط ہوتی رہیں گی، دوسری طرف نادار اور حریص لوگوں میں ارتکاب جرائم کا میلان بڑھتا رہے گا۔

شاہ صاحب ایک طبقہ کی ایسی خوش حالی کو جو ان تکلفات سے مرصع ہو جس سے اقتصادی توازن بگڑ جائے۔ رفاہیت بالغہ سے تعبیر کرتے ہیں اور سوسائٹی کے لیے اس کو بدترین جرم اور اس کے خلاف جنگ کو مقدس جہاد قرار دیتے ہیں۔ ان کی تصانیف رفاہیت بالغہ کی مذمت سے بھری ہوئی ہیں۔

سیاسیات اسلامیہ

مولانا زاہد الراشدی

اسلام کا تصورِ حکومت و ریاست

اسلام نے حکمرانی کا جو تصور دیا ہے، وہ مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ کائنات کا اصل حکمران اللہ تعالیٰ ہے، اور اللہ رب العزت نے بنی نوع انسان کی ہدایت، راہنمائی اور سیاسی قیادت کے لیے حضراتِ انبیاء علیہم الصلوۃ والتسلیمات کو مبعوث فرمایا، چنانچہ ان پاک نفوس نے نہ صرف انسانیت کو اللہ تعالیٰ کے راستہ کی طرف بلایا بلکہ انسان کے اجتماعی و سیاسی معاملات میں بھی اس کی قیادت و راہنمائی فرمائی، جیسا کہ امام مسلمؒ نے ''الجامع الصحیح'' میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جناب نبی اکرام ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ :

''بنی اسرائیل کی سیاسی قیادت ان کے پیغمبر کرتے تھے ایک پیغمبر دنیا سے تشریف لے جاتے تو ان کی جگہ دوسرے پیغمبر آجاتے لیکن، میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا البتہ خلفاء ہوں گے۔''

گویا اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی مذہبی اور سیاسی قیادت کو انبیاء علیہم السلام کی شخصیات میں جمع کر دیا اور چونکہ جناب نبی اکرم ﷺ کے بعد کسی نبی نے نہیں آنا تھا اس لیے آپ ﷺ کے بعد یہ ذمہ داری ''خلفاء'' کے سپرد کر دی گئی تاکہ وہ مذہبی، سیاسی اور عسکری امور میں جناب نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ کی قیادت کے فرائض سرانجام دے سکیں۔ اسی لیے چنانچہ ابن خلدون نے تاریخ ج ۱ ص ۳۳۹ میں اور شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفاء ص ۲۸ میں ''خلافت'' کی تعریف اس طور پر کی ہے کہ :

''خلافت جنابِ نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے ملتِ اسلامیہ میں اسلامی احکام و قوانین کی عملداری، انتظامی، عسکری اور سیاسی امور کی انجام دہی کا نام ہے۔''

خلافت کے اس تصور کے ساتھ جو شخص بھی برسرِ اقتدار آئے، اسے خلیفہ امام یا امیر کسی بھی نام سے پکارا جا سکتا ہے اور وہ قرآن و سنت کے دائرہ میں چلنے کا پابند ہے۔

خلافت و امامت کا فرق :

یہاں خلافت یا اسلامی حکومت کے حوالہ سے اہل سنت اور اہل تشیع کے اختلاف کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اہل سنت کے ہاں یہ نظام خلافت کہلاتا ہے جبکہ اہل تشیع اسے امامت سے تعبیر کرتے ہیں اور خلافت و امامت میں چند اصولی اور بنیادی فرق پائے جاتے ہیں :

(۱) اہل سنت کے موقف اور روایات کے مطابق جناب نبی اکرم ﷺ نے جانشین نامزد نہیں کیا تھا بلکہ خلیفہ کے انتخاب کو امت کی صوابدید اور اختصار پر چھوڑ دیا تھا چنانچہ مسلم شریف کی ایک روایت میں ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے ایک موقع پر خلیفہ نامزد کرنے کا ارادہ فرمایا، لیکن پھر یہ کہہ کر ارادہ ترک کر دیا کہ یابی اللہ والمومنون الا ابا بکر، ابو بکر کے سوا کسی اور خلیفہ بنانے سے اللہ تعالیٰ بھی انکار کرتا ہے اور مومنین بھی اس پر راضی نہیں ہوں گے۔ یہ جناب نبی اکرم ﷺ کی طرف سے امت کی اجتماعی صوابدید پر اعتماد کا اظہار تھا اور حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ کسی کو نامزد کر کے نامزدگی کو ہمیشہ کے لیے سنت نہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابو بکر کی خلافت کا فیصلہ عوامی رائے بلکہ اچھے خاصے عوامی بحث و مباحثہ کے بعد ہوا اور اس طرح امت کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ اپنے حکمران کا خود انتخاب کرے۔ اس کے برعکس اہل تشیع کے نزدیک امام کے طور پر حضرت علیؓ کا تقرر خود جنابِ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا، اسی لیے انہیں ''وصی'' کہا جاتا ہے۔

(۲) امام اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، اسی لیے وہ معصوم ہوتا ہے مگر خلیفہ احکامِ اسلامی کے نفاذ اور حق حکمرانی استعمال کرنے میں اللہ تعالیٰ کی نمائندگی نہیں کرتا بلکہ جنابِ نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتا ہے۔ قاضی ابو یعلیٰؒ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضرت ابو بکرؓ کو ''یا خلیفۃ اللہ'' کہہ کر خطاب کیا تو حضرت صدیقِ اکبرؓ نے اسے ٹوک دیا اور فرمایا لست بخلیفۃ اللہ انا خلیفۃ رسول اللہ میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ نہیں ہوں بلکہ رسول اللہ کا خلیفہ ہوں۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ امام اللہ تعالیٰ کا نمائندہ ہونے کی وجہ سے خود دلیل کی حیثیت رکھتا ہے اور کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے، مگر خلیفہ جنابِ نبی اکرم ﷺ کی نیابت کرتے ہوئے اپنے فیصلے اور حکم میں قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے جیسا کہ صدیقِ اکبرؓ کی خلافت کا منصب سنبھالنے کے بعد اپنے پہلے خطبہ میں یہ واضح کر دیا تھا کہ میں اگر قرآن و سنت کے مطابق چلوں تو میری اطاعت تم پر ضروری ہے اور اگر اس کے خلاف چلنے لگوں تو تم پر میری اطاعت ضروری نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں امام اہل تشیع کے نزدیک ''معصوم'' ہوتا ہے اور اس بات کی خود دلیل ہے اور وہ کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے مگر اہلِ سنت کے نزدیک خلیفہ کی شرعی حیثیت ''مجتہد'' کی ہے وہ قرآن و سنت کی دلیل کا پابند ہے، اس کا اپنا فیصلہ اجتہادی فیصلہ ہوتا ہے جس سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور اس میں صواب کے ساتھ ساتھ خطا کا احتمال بھی موجود ہوتا ہے جیسا کہ خلفاءِ راشدین کے فیصلوں سے اختلاف کیا جاتا رہا ہے۔ اسی بنیاد پر امام کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا، مگر خلیفہ عوام کے سامنے جواب دہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے پہلے خطبہ میں فرمایا تھا کہ اگر سیدھا چلوں تو میرا ساتھ دو لیکن اگر ٹیڑھا چلنے لگوں تو مجھے سیدھا کر دو، یہ خلیفہ کا عوام کے سامنے جواب دہ ہونا ہے اور عوام کا حق احتساب ہے جو خلافتِ راشدہ کے دور میں عملی طور پر موجود رہا ہے۔

(۳) امام نسبی اور خاندانی ہے جیسا کہ اہل تشیع کے بارہ امام ایک ہی نسب اور خاندان سے ہیں مگر خلافت نسبی اور خاندانی نہیں ہے، اس لیے کہ چاروں خلفاء راشدین حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد صحابہ کرامؓ کے دور میں بننے والے مسلمانوں کے متفقہ امیر المومنین حضرت معاویہؓ میں سے کوئی بزرگ بھی ایک دوسرے کا نسبی اور خاندانی وارث نہیں تھا، اگرچہ بعد میں مسلمانوں کی خلافت ہمیشہ خاندانی دائروں میں ہی چلتی آرہی ہے لیکن حضراتِ صحابہ کرامؓ کے دور کا نظام خلافت جو آئیڈیل اور اسوہ کی حیثیت رکھتا ہے، خاندانی اور نسبی خلافت کے دائرہ سے ہٹ کر تھا۔ اماموں کی تعداد بارہ پہنچ کر مکمل ہو گئی ہے اور اہل تشیع کے بقول بارہویں امام ہی آخری امام ہیں جو زندہ ہیں اور وہی قریب قیامت میں ظاہر ہو کر امت پر حکمرانی کریں گے۔ جبکہ اہل سنت کے نزدیک خلفاء کا سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا اور قیامت سے پہلے جن ''امام مہدی'' کا ظہور ہو گا وہ اگرچہ حضرت علیؓ حضرت فاطمہؓ کی اولاد میں سے ہوں گے لیکن اپنے دور میں پیدا ہوں گے اور ان کا ظہور ہو گا جس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد سے امت کی قیادت کریں گے اور کفر کی طاقتوں کو شکست دے کر اسلامی حکومت قائم کریں گے۔

''دورِ حاضر میں ایران کا دستور ''امامت'' کی بنیاد پر ترتیب دیا گیا ہے کہ امام غائب کی فقیہ کے طور پر آیت اللہ خمینی اور ان کے بعد آیت اللہ خامنائی اس منصب پر فائز ہوئے ہیں ان کے ساتھ ایک ''شوریٰ نگہبان'' ہے اور ولایت فقیہ اور شوری نگہبان کو دستوری طور پر یہ حیثیت حاصل ہے کہ ان کے فیصلے حکومت، پارلیمنٹ، عدالت اور دیگر تمام شعبوں پر بالادستی رکھتے ہیں، وہ ان میں سے کسی کا فیصلہ بھی منسوخ کر سکتے ہیں، مگر ان کے فیصلے کو کسی جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا، حکومت اور پارلیمنٹ وقفہ وقفہ سے منتخب ہوتی ہیں مگر ''ولایت فقیہ'' کا منصب تاحیات ہے۔''

اس مقابلے میں سعودی عرب اور پاکستان کے دستور ''خلافت'' کے تصور کے قریب ہیں، سعودی عرب میں حاکمیت اعلیٰ قرآن و سنت کی ہے، حق حکمرانی آل سعود کو حاصل ہے مگر وہ قرآن و سنت کے مطابق حکومت کرنے کے پابند ہیں۔ پاکستان کے دستور میں حاکمیت اعلی اللہ تعالیٰ کی تسلیم کی گئی ہے، حق حکمرانی عوام کے منتخب نمائندوں کو حاصل ہے اور حکومت اور پارلیمنٹ دونوں دستوری طور پر قرآن و سنت کے پابند ہیں۔

خلافت اور امامت کے اس اصولی فرق کو سمجھ لینے سے ایک اور بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ خلافت کے نظام پر تھیا کریسی کا جو الزام عائد کیا جاتا ہے وہ درست نہیں ہے۔ تھیا کریسی خدا کے نام پر حکومت کرنے کو کہتے ہیں جہاں حکمران اللہ تعالیٰ کا نائب کہلا کر ہر قسم کی تنقید و اختلاف سے بالاتر سمجھا جاتا ہے۔ یہ تصور پاپائے روم کی حکمرانی کے دور میں سامنے آیا تھا کیونکہ پوپ کو خدا کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا اس کی بات فائنل ہوتی تھی اور اسے آخری اتھارٹی کا درجہ حاصل تھا۔

مغربی دنیا میں پاپائے روم کو صدیوں تک حکمرانوں کے سرپرستِ اعلیٰ کی حیثیت حاصل رہی ہے اور اس کی بات حکومت و سیاست میں بھی حرفِ آخر سمجھی جاتی تھی، اس لیے اس تھارٹی کے خلاف بغاوت ہوئی اور حکومت و سیاست کو پوپ کی سرپرستی سے الگ کرتے ہوئے مذہب سے بھی آزاد کر دیا گیا۔

چنانچہ آج جب کسی جگہ اسلامی حکومت کی بات کی جاتی ہے تو اسے پس منظر میں ''تھیا کریسی'' قرار دے کر بہت سے حلقوں میں قابلِ اعتراض قرار دیا جاتا ہے لیکن ''خلافت'' کے مذکورہ تصور اور دائرے کو سامنے رکھتے ہوئے اس پر تھیا کریسی کا یہ الزام درست نہیں ہے، اس لیے کہ خلیفہ معصوم نہیں، عوام کا منتخب نمائندہ ہوتا ہے۔ اس کی ہر بات سے دلیل کی بنیاد پر اختلاف کیا جا سکتا ہے عوام اس کا احتساب کر سکتے ہیں حتیٰ کہ اسے معزول بھی کیا جا سکتا ہے اور وہ خود اتھارٹی نہیں ہے۔ اس لیے خلافت کو تھیا کریسی قرار دینا خلافت کے مفہوم و نظام سے ناواقفیت ہونے کی دلیل ہے۔ البتہ اہل تشیع کی امامت کا مفہوم تھیا کریسی کے قریب قریب ہے لیکن اہل سنت اسے قبول نہیں کرتے۔

خلاصہ یہ کہ قرآنِ پاک اور جناب نبی اکرم ﷺ کے ارشاد و عمل کے حوالہ سے اسلامی حکومت کی تین بنیادیں نظر آتی ہیں :

(۱) حکومت کا قیام عوام کی مرضی سے ہوگا۔

(۲) خلیفہ کو استبدادی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے۔ بلکہ وہ قرآن وسنت کے احکام کا پابند ہوگا۔

(۳) قرآن وسنت کے صریح احکام کے مقابلہ میں عوام رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

(۴) حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہے اور عوام کو حکومت کے احتساب کا حق حاصل ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اسلام نے سربراہ مملکت کو اسلامی احکام وقوانین کا پابند بنانے کے بعد خلافت کی اصطلاح پر اصرار نہیں کیا اور نہ باقی تفصیلات کو چھیڑا ہے، بلکہ ایک اصول طے کر لینے کے بعد تفصیلات اور جزئیات میں ملتِ اسلامیہ کو پیش آمدہ حالات کے مطابق کوئی سی راہ اختیار کر لینے کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ اسلام کو اصطلاحات سے نہیں بلکہ اسلامی اصول واحکام کی پابندی سے غرض ہے اور جب حکمران کے لیے یہ طے ہو گیا ہے کہ وہ جناب نبی اکرم ﷺ کا نائب ہے اور حکمرانی میں انہی کی ہدایات واحکام کا پابند ہے تو اسے کسی بھی نام سے پکارا جائے اور اس کے لیے باقی تفصیلات کچھ بھی طے کر لی جائیں، اسلام کو اس سے بحث نہیں ہے حتیٰ کہ ملوکیت اور بادشاہت بھی جو آج کی دنیا میں مبغوض ترین اصطلاحات ہیں، اسلام کے ہاں مطلقاً ناپسندیدہ نہیں ہیں، اور اسلام نے ظالم و جابر بادشاہوں کے ظلم و جبر کی سخت ترین الفاظ میں مذمت کرنے کے باوجود ''ملوکیت'' کی اصطلاح کو اپنے لیے چڑ نہیں بنایا بلکہ خود قرآنِ پاک میں کم از کم چار بزرگ ہستیوں کا ملوکیت کے حوالے سے ذکر موجود ہے۔

حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام تو خود پیغمبر ہونے کے باوجود بادشاہ تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ایک بادشاہ کے وزیر بنے اور بنی اسرائیل کے لیے وقت میں حضرت طالوت کی بادشاہت کا خود اللہ نے اعلان فرمایا۔

اسی طرح جناب نبی اکرم ﷺ نے بھی متعدد مقامات پر ملوکیت کی اصلاح استعمال کی ہے حتیٰ کہ مجمع الزوائد ج ۵ ص ۱۹۰ میں حافظ ابن حجر المکی نے طبرانی کے حوالے سے سند صحیح کے ساتھ جو روایت نقل کی ہے اس میں جناب نبی اکرم ﷺ نے ''خلافت ورحمت'' اور ''امارہ ورحمت'' کے ساتھ ''ملوکیت ورحمت'' کا ذکر فرمایا ہے جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ اسلام صرف حکمران کو جناب نبی اکرم ﷺ کا نائب اور ان کی ہدایات کا پابند دیکھنا چاہتا ہے قطع نظر اس سے کہ وہ خلیفہ کہلائے، امیر کہلائے یا بادشاہ۔ ابن تیمیہ کے مجموعہ فتاویٰ میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔

ان اصولوں کی وضاحت کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے طریق کار، حکومتی ڈھانچہ اور عوام کے حق احتساب کو عملی شکل دینے کے تمام امور حالات پر چھوڑ دیے گئے ہیں اور اس کے لیے ہر دور میں اس وقت کے حالات اور ضروریات کے مطابق کوئی بھی طریق کار اختیار کیا جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امت کے چودہ سو سالہ تعامل میں مختلف طرز رہائے حکومت کو عوامی اور علمی حلقوں کی طرف سے جواز کا درجہ اور سند حاصل ہوتی رہی ہے۔ گویا اس پہلو کو امت کی صوابدید پر ہر دور کے حالات کے تناظر اور ضروریات کے لیے اوپن چھوڑ دیا گیا ہے جو بہت بڑی حکمت کی بات ہے اس کا مطلب اس اہم کام کو نظرانداز کر دینا نہیں ہے بلکہ ایسا کر کے حالات کے اتار چڑھاؤ، نسل انسانی کے معاشرتی ارتقا، زمانہ کے تغیرات اور مختلف علاقوں اور زمانوں کے لوگوں کے مزاج و نفسیات میں پائے جانے والے فطری تنوع کا لحاظ رکھتے ہوئے ہر قسم کے جائز امکانات کا راستہ کھلا رکھا گیا ہے جو مسلسل تغیر پذیر انسانی سوسائٹی کے فطری تقاضوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہے البتہ بنادی اصول اور حدود قرآن وسنت میں ضرور بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ کسی دور میں کوئی اسلامی حکومت ان بنیادی مقاصد اور دائرہ کار سے تجاوز نہ کرنے پائے۔

مختصراً یہ کہ اسلام میں :

(۱) مسلم حکومت دینی احکام وقوانین کے نفاذ اور سیاسی، انتظامی و عسکری امور کی انجام دہی میں جنابِ نبی اکرم ﷺ کی نائب اور ان کی ہدایات کی پابند ہے۔

(۲) ایسی حکومت کا قیام مسلمانوں پر شرعاً فرض ہے۔

(۳) اس نوعیت کی حکومت اور اس کے سربراہ کے لیے کوئی بھی اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے۔

علم و نظر

فلسفہ کیا ہے ؟ فلسفہ کا رد

مزمل شیخ بسمل

فلسفہ کا رد کیا ہے ؟ فلسفہ کا رد کیا ہوتا ہے ؟ اور اس کا رد کیسے کیا جاتا ہے ؟ یہ باتیں سمجھ سے بالا ہیں۔ میں کبھی یہ طے نہیں کر پایا کہ جو لوگ اس ترکیب یعنی ''فلسفہ کا رد'' کو استعمال کرتے ہیں ان کے نزدیک فلسفہ آخر کیا شے ہے ؟

جب ہم عیسائیت کے رد، یہودیت کے رد، ہندومت یا بدھ مت کے رد اسلام یا قادیانیت کے رد کی بات کرتے ہیں تو سمجھ میں آجاتا ہے کہ ہمیں ان کے نظریات سے اختلاف ہے۔ ایسے میں ہم کچھ دلائل اکٹھا کر کے مخالف کے رد میں پیش کرتے ہیں چار و ناچار ان سے اپنے مقاصد بھی حاصل کرتے رہتے ہیں۔

لیکن جب آپ فلسفہ کے رد کی بات کرتے ہیں تو بات بہت مختلف ہو جاتی ہے۔ پھر پوچھا جائے گا کہ فلسفہ میں آپ کس چیز کا رد کرنا چاہتے ہیں ؟ آیا آپ کو لفظ ''فلسفہ'' سے کوئی پریشانی ہے ؟ یا پھر فلسفہ کی ہجا میں کوئی کمی بیشی رہ گئی ہے جسے آپ کے مطابق درستگی کی ضرورت ہے ؟ بھئی سیدھی سی بات جو مجھے سمجھ آئی ہے وہ یہ کہ اس کا تھوڑا کانسیپٹ بنا لینے کی ضرورت ہے کہ فلسفہ کہا کسے جاتا ہے۔ اس کے بعد فلسفے کے رد کی بات کر لیتے ہیں۔ میں بات کو الجھانا نہیں چاہتا۔ سیدھی سی بات کروں گا جسے ہر شخص با آسانی سمجھ سکے۔

برٹینکا انسائیکلوپیڈیا کے مطابق :''(انسانوں کے) بدیہی یا اولین نظریات واعتقادات کی بنیادوں کا تنقید جائزہ، اور ان اعتقادات میں موجود تصورات کی بنیادوں کا تجزیہ ''فلسفہ کہلاتا ہے۔''

آکسفورڈ ڈکشنری کے مطابق :'' قدرت، کائنات بشمول انسانی زندگی کے وجود کے مقصد یا غایت کا مطالعہ فلسفہ ہے۔''

یہ تو وہ ہے جو کہ اصطلاحی طور پر لفظ ''فلسفہ'' کی تعریف کی خاطر کہا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ لفظ فلسفہ کی غیر اصطلاحی تعریفات بھی ہیں۔ جیسے :

"ایک مخصوص نظریہ یا مجموعہ نظریات جو حیات وکائنات کی توجیہہ کے نتیجے میں قائم کی جائے"

اب فیصلہ کرنا کافی آسان ہے "فلسفہ کارد" درحقیقت کس قدر بے معنی ترکیب ہے۔ یعنی آپ یہ ترکیب استعمال کر کے آخر کس چیز کا رد کرنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ انسان کی جستجو اور تنقیدی فطرت پر پابندی لگانا چاہتے ہیں ؟ یا اس سے سوچنے کی آزادی چھیننا چاہتے ہیں ؟ فلسفہ کی اصطلاحی تعریف کا اگر سائنس اور فلسفہ کو مقابلے پر لا کر فلسفہ کو حقیر یا مردہ کہہ کر سائنس کا ڈنکا بجاتے ہیں انہیں اپنی رائے پر نظر ثانی کی ضرورت ہے اور وجہ یہ ہے کہ سائنس اپنی ذات میں کوئی مستقل بالذات نظام نہیں، بلکہ اسے فلسفہ ہی کی ایک شاخ کہا جا سکتا ہے جو قدم قدم پر فلسفہ ہی کا محتاج ہے۔ کیونکہ جہاں کہیں بھی سائنس کا بندھن فلسفیانہ موشگافیوں سے ٹوٹے گا وہیں سائنس زوال پذیر کا شکار ہو جائے گی۔ اور وجہ غیر اصولی اور غیر منطقی استدلال ہوگا۔ اب جب آپ "استدلال" کی حدود سے نہیں نکل سکتے تو پھر فلسفہ کی حدود کیسے نکلیں گے ؟

آگے چلیے آخری اور غیر اصطلاحی تعریف کے مطابق فلسفہ کوئی بھی نظریہ ہوسکتا ہے سطحی طور پر جو حضرات "فلسفہ کارد" کرنے کی بات کرتے ہیں انہیں اس اصطلاحی اور غیر اصطلاحی کا فرق ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یعنی کوئی بھی نظریہ بجا طور پر ایک "فلسفہ" کہلا سکتا ہے۔ جیسے ڈراون کا نظریہ ارتقاء، یا آئنسٹائن کا نظریہ اضافیت وعلی ہذا القیاس۔ اسی طرح تمام مذاہب اپنے نظریات میں ایک "فلسفہ" ہی ہوتی ہیں۔ اسلام، عیسائیت اور یہودیت اس تعریف کے مطابق بجا طور پر فلسفہ کہلا سکتے ہیں۔

یہاں آکر آپ سے یہ سوال ضرور کیا جا سکتا ہے کہ آپ فلسفے کے رد سے کیا مراد لیتے ہیں ؟ آپ کونسے فلسفے کا رد کرنا چاہتے ہیں ؟ آیا آپ عقلیات کا رد کرنا چاہتے ہیں ؟ اگر آپ کا مقصد یہی ہے تو یہ ممکن نہیں۔ کیونکہ اس معنی میں ابراہیم علیہ السلام بھی ایک فلسفی ہی تھے جنہوں نے سورج اور مورتیوں کی پرستش کا انکار کیا تھا، وہ ایک متشکک فلسفی تھے جو اپنے موجودہ خداؤں کے منکر ہو گئے تھے۔ سوچنا اور استدلال کرنا انسان کی فطرت میں پنہاں ایسی چیز ہے جسے دبایا نہیں جاسکتا۔

چنانچہ فلسفہ فی نفسہٖ کا رد تو ممکن نہیں۔ اب بات آتی ہے اگلی تعریف کی۔ ان "فلسفیوں (نظریات) کی جن سے آپ کو اختلاف ہے، تو اس کے رد میں آپ حق بجانب ہیں۔ لیکن آپ کو پہلے یہ ضرور بتانا پڑے گا کہ آپ فلسفیوں کے کن مخصوص نظریات سے خفا ہیں ؟ اور آپ ان کے خلاف کیا دلائل رکھتے ہیں ؟ پھر میں بار ہا عرض کرتا رہا ہوں کہ صرف تردید سے کام نہیں چلتا۔ کسی بھی نظریے کی "تردید محض" درحقیقت علم سے بد دیانتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ آپ اپنا مکمل نظام فکر ترتیب دیں۔ اس کی عقلی اور نقلی توجیہات اور توضیحات مرتب کریں، اور دنیا کو یقین دلائیں کہ آپ ایک محکم "فلسفہ" کے حامل ہیں۔

اب یہاں تک آنے پر چند نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں فلسفہ انسانی ریوں کی سلامتی، معاشرت اور جستجوئے حیات کے لیے ایک انتہائی پختہ اور ناگریز ہتھیار ہے۔

(۲) اصطلاحی طور پر فلسفہ کائنات اور حیاتِ انسانی کے غرض وغایت، اور فطرت کے تنقیدی جائزہ کا نام ہے۔ اس لیے فلسفہ انسانی کی عقلی ضرورتوں کا ایک ناگریز رویہ ہے جس کے رد کی بات کرنے والا درحقیقت خود اپنے مقدمے ہی کی نفی کر رہا ہوتا ہے۔

(۳) غیر اصطلاحی طور پر ہر نظریہ ایک "فلسفہ" ہی ہوتا ہے، اس لیے کوئی ایک یا متعدد نظریات جو کسی فلسفی کی جانب سے آئے ہوں، ان کی تردید خود فلسفہ کی تردید نہیں ہوتی۔ یعنی آپ ارسطوئی مثالیے، کانٹیانہ مثالیت، یا ہرقلیطی مادیت یا پھر ہیگلی اور مارکس مادیت پر اپنی رائے تو ضرور پیش کر سکتے ہیں، تاہم یہ فلسفہ کا رد نہیں ہوتا، اگر ایسا ہوتا تو یہ سارے ہی فلسفی "فلسفہ کارد" کرنے والوں میں گنے جاسکتے ہیں۔

(۴) یہ کہنا کہ فلسفہ کسی اہمیت کی حامل چیز نہیں، ایک انتہائی سطحی سی بات ہے۔ کیونکہ آپ کے حرکات وسکنات کا ہر ہر لحظہ دنیا کے غالب فلسفوں ہی سے مرتب ہوتا ہے، چاہے وہ موجودہ معاشیات کے فلسفے کی صورت میں ہو، یا دنیا کے حالیہ سیاسی فلسفے کی صورت میں۔ دراصل جب آپ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ فلسفہ صرف مشکل باتیں کرنے کا نام ہے تو ایسے میں یہیں نتائج نکلتے ہیں۔ حالانکہ آپ کے گھر میں (بقیہ ص: ۴)

بقیہ: جمعیت علماء : حضرت مدنی رح کی تعلیمات۔۔۔

خندہ پیشانی سے ادا فرمایا۔ ۱۹۴۸ء میں جمعیت علماء ہند کا پندرھواں اجلاس عام بمبئی میں ۲۶، ۲۷/ اپریل کو ہوا جس کی صدارت شیخ الاسلام حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی تھی اُس میں پاس ہونے والی تجویز نمبر ۲ یہ تھی :

"۱۵/اگست (۱۹۴۷ء) کے اعلانِ آزادی کے ساتھ ساتھ چونکہ ہندوستان انڈین یونین اور پاکستان دو جدا جدا ملکوں کے نام سے عمل میں آ گئی اس لیے جمعیت علماء ہند کا یہ اجلاسِ عام یہ اعلان ضروری سمجھتا ہے کہ آئندہ جمعیت علماء ہند کا نظام عمل صرف انڈین یونین تک محدود رہے گا اور اُس کے فیصلے انڈین یونین کے صوبوں ہی تک نافذ العمل سمجھے جائیں گے، پاکستان میں شامل رہ جانے والی شاخوں سے جمعیت علماء ہند کا کوئی تعلق نہ ہوگا اور اب اُن کا فرض ہے کہ اپنی صوابدید اور حالات ومصالح کے مطابق اپنے لیے راہِ عمل اختیار کریں۔"

(جمعیت علماء ہند، دستاویزاتِ مرکزی اجلاس ہائے عام ص: ۳۵)

درج بالا تجویز میں خطہ پاکستان میں رہ جانے والے جمعیت علماء ہند کے قائدین اور کارکنان کو جمعیت علماء ہند سے الگ کر کے پاکستان کی خدمت کے لیے فارغ کر دیا گیا، یہ اُن کے اخلاص پر مبنی فیصلہ تھا اس فیصلے پر امام الاولیاء شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کو افسوس ہوا اور اُنہوں نے حضرت مدنیؒ کو اپنی کیفیت سے آگاہ فرمایا کہ "جن بزرگوں کی دامن گیری سے مجھے قیامت کے دن نجات کا بھروسہ تھا آج انہوں نے ہمیں الگ کر دیا۔"

اس پر حضرت مدنیؒ نے ان کو تحریر فرمایا :

سیّدنا المحترم زیدمجدکم   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

والا نامہ باعث سرفرازی ہوا۔ مندرجہ مضامین سے سخت تاثر ہوا۔ محترما ! کیا آپ سے علاقہ کسی انجمن کے وجود وعدم اور اُس کی ممبری پر موقوف ہے جس پر آپ متاثر ہوئے ہیں؟ ہم اور آپ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز کے دربار کے دریوزہ گر اور اس بنا پر خواجہ تاش ہیں، یہ روحانی تعلق کسی طرح ٹوٹ نہیں سکتا، اگر مادّی اَسباب حائل ہو بھی جائیں تو کیا ہے؟ ہماری اَرواح ایک ہی دربار گہربار کی حاضر باش ہیں حَفِظَنَا اللّٰہُ وَاِیَّاکُم مِّنۡ کُلِّ سُوۡءٍ وَّ رَزَقَنَا جَمِیۡعًا رِضَاہُ فِی الدُّنۡیَا وَالۡاٰخِرَۃِ اٰمین!

گھر کے لوگوں اور صاحبزادوں اور دیگر احباب پُرسانِ حال سے سلام مسنون عرض کر دیں، دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔ والسلام ننگِ اَسلاف حسین احمد غفرلہٗ دیوبند ۳/ربیع الثانی ۱۳۶۷ھ

(مکتوباتِ شیخ الاسلامؒ ج:۱، ص: ۳۳۲)

حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور جمعیت علماء ہند کے فیصلے کے مطابق پاکستان میں رہ جانے والے وہ علماء جو "جماعت شیخ الہندؒ" کے رُکن تھے اُنہوں نے "جمعیت علماء اسلام" میں رُوح ڈال کر زندہ کیا۔ جمعیۃ علماء اسلام قائم کرنے والے بزرگ قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگی قیادت کے طرز عمل سے دلبرداشتہ تھے یا نجی مصروفیات کی بنا پر غیر فعال، خدا کی شان کہ جمعیت علماء ہند کی فکر رکھنے والا طبقہ پاکستان کی حفاظت کے لیے آگے بڑھا، حضرت لاہوری اور حضرت مولانا مفتی محمود رحمۃ اللہ علیہما نے ۱۹۵۶ء میں جمعیت علماء اسلام کو زندہ کیا، یہ جمعیت علماء اسلام کی نشاۃِ ثانیہ تھی، سندھ میں حضرت مولانا صادق صاحبؒ کی، پنجاب میں حضرت لاہوریؒ کی، بلوچستان میں حضرت مولانا عرض محمد صاحبؒ کی اور سرحد میں حضرت مولانا غلام غوث ہزارویؒ کی محنتیں رنگ لائیں۔

جمعیت علماء اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے وقت اُس کے پرانے بزرگوں کو بھی سامنے لایا گیا لیکن رفتہ رفتہ اُن کا جو میدان تھا اُسی کی طرف لوٹ گئے لیکن ظلم یہ کہ پھر بھی جمعیت علماء اسلام کے زندہ کرنے والوں کو "قابضین" کہا گیا اور اُن کے ایمان اور حب الوطنی میں ہمیشہ شبہ کیا گیا اور اب بھی یہی صورتِ حال ہے،

جمعیت علماء اسلام نے پاکستان میں دین واسلام اور اُن کے حاملین کے لیے بڑی خدمات انجام دی ہیں، اس میں دو رائے نہیں ہوسکتیں، جمعیت علماء اسلام دیوبندی مکتبِ فکر کی نمائندہ جماعت ہے۔ حضرت مدنیؒ نے روحانی تعلق اور فکر میں اتحاد کو باقی رکھا ہے۔

اکابر شناسی

مولانا تنویر احمد شریفی

جمعیت علماء حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی نوراللہ مرقدہ کی تعلیمات کی روشنی میں

سرورِ کائنات خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ارشاد کے مطابق سارے مسلمان جسمِ واحد کے مانند ہیں اس مبارک ارشاد سے یہ معلوم ہوگیا کہ انسان ''اجتماعی زندگی'' کی فطرت اپنے اندر رکھتا ہے۔ مؤرخِ ملت حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''نوعِ انسان کو، ورنہ کم از کم ایک ملک کے انسانوں کو ایک جسم قرار دے کر اُس کی صحت کے تحفظ اور ترقی اور اُس کی بیماریوں اور خرابیوں کے زائل کرنے کی تدابیر سوچنا اور اُن کو نافذ کرنا سیاست یا نظامِ حکومت کہلاتا ہے۔'' (جمعیۃ علماء کیا ہے؟ ص:۷)

جب تک اجتماعی زندگی فطرت کے مطابق رہی اہلِ علم درس وتدریس اور دعوت وتبلیغ میں سرگرم رہے عہدِ مغلیہ میں حکمران اس فطرت سے رُوگردانی کرنے لگے اور اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ''غیر فطری طاقت'' کے لیے نرم گوشہ رکھ کر اپنے گھر اور ملک وملت کے بھید دینے لگے تو اہلِ علم میں ''عزیمت'' کو برداشت کرنے والوں کی جماعت کے رُوح ورواں سراج الہند حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان کے دارُالحرب ہونے کا فتوی دیا۔ یہ وقت شروع ہو چکا تھا اور اہلِ نظر نے اسے محسوس کرلیا تھا کہ اب مغلیہ خاندان کے زوال کے بعد اسلامی قوانین کا نفاذ تو دُور کی بات ہے خود اِسلام کا ہندوستان میں باقی رہنا مشکل ہو رہا ہے، ایسی صورت میں تمام تر ذمہ داری علمائے شریعت پر آ گئی تھی اس لیے وہ حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث اور شرعی طور پر مسلمانوں کے رہنما اور ذمہ دار تھے، اسی ذمہ داری کو نبھاتے ہوئے باعزیمت اہلِ علم حالات کے مطابق تدریس وسلوک اور دعوت کے شعبے کے ساتھ ساتھ ملکی حفاظت کے لیے خانقاہوں اور درس گاہوں کی چار دیواری سے باہر نکلے اور قوم کو بیدار کیا اور اُن کی رہنمائی کی، ۱۸۵۷ء کا معرکہ حضرت شاہ عبد العزیز صاحبؒ کے فتوی کی علمی شکل تھی۔

۱۸۵۷ء کا معرکہ بظاہر ناکام رہا لیکن یہ سمجھ لیا جائے کہ ۱۸۵۷ء میں ناکامی نہ ہوتی تو تحریک وہیں ختم ہو جاتی اور اگر ایسا ہوتا تو بظاہر یہ دینی تعلیم گاہوں کا ایک وسیع نیٹ ورک آج نہ ہوتا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد اہلِ علم نے اپنی جدوجہد کا طریقِ کار بدلا اور ۱۵ر محرم الحرام ۱۲۸۳ھ/ ۳۰رمئی ۱۸۶۶ء جمعرات کے دن ''دارُالعلوم'' دیوبند میں قائم ہوگیا یہ دیوبند کی سرزمین پر علومِ اسلامیہ کی نشاۃِ ثانیہ کا دن تھا۔ دارُالعلوم دیوبند جس وقت قائم کیا گیا اُس وقت ہندوستان میں قدیم تعلیم گاہیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں اُس وقت یہ سماں بندھ چکا تھا کہ اسلامی علوم ہندوستان سے جا چکے ہیں۔ ہم اپنی تاریخی کتب میں اس کی تفصیل دیکھ سکتے ہیں خدا کرے ہمارے اندر اپنی تاریخ کو جاننے کی جستجو جاگ جائے، آمین !

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ کی بات حضرت مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ (رئیس القلم) نقل کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :

''حضرت الاستاذ (مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) نے اس مدرسے کو کیا درس وتدریس تعلیم وتعلّم کے لیے قائم کیا تھا ؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ اِدارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تا کہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی ہو۔'' (ماہنامہ دار العلوم دیوبند جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ/ مارچ ۱۹۵۳ء ص: ۴۲)

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے پیش رو کا جو نظریہ پیش کیا ہے اُسی کو پیش نظر رکھ ''رجالِ کار'' مہیا کرنے کے لیے ۲۷ر رمضان المبارک ۱۳۲۷ھ کو ''الانصار'' کے نام سے فضلائے دارُالعلوم کی ایک جمعیت کا قیام عمل میں آیا جسے ہم ''جمعیت الانصار'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اُس کے بانی حضرت شیخ الہندؒ تھے اور حضرت شیخ الہندؒ بالاتفاق حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے جانشین تھے حضرت شیخ الہندؒ نے ''جمعیۃ الانصار'' کا ذمہ دار اپنے نورِ نظر شاگرد حضرت مولانا عبیداللہ سندھیؒ کو بنایا جو اپنے استاذِ گرامی کی نظر سے ''امامِ انقلاب'' ہوئے۔ جمعیۃ الانصار کے مقاصد کا اعلان نہایت مختصر الفاظ میں اِس طرح کیا گیا :

''اِس جمعیت کی غرض مدرسہ عالیہ دیوبند کے مقاصد کی تائید وحمایت اور اُس کے پاک اثر کی ''ترویج و اشاعت ہے۔'' (امامِ انقلاب حیات وخدمات ص:۶۸)

ان چھہتر حروف اور چوبیس الفاظ میں کیا کچھ نہیں کہہ دیا گیا ؟ ان ہی الفاظ سے ایک جامع شرح بن سکتی ہے۔

۱۳۳۳ھ میں حضرت شیخ الہندؒ حجاز مقدس تشریف لے گئے اور اس سے پہلے اپنے مشن کی کامیابی کے لیے حضرت مولانا سندھیؒ کو کابل بھیج چکے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کو اوائل ۱۳۳۵ھ (۱۹۱۷ء) میں مکہ مکرمہ سے انگریز نے گرفتار کرا لیا اور ان کو ان کے ساتھیوں کو مالٹا بھیج دیا، اُدھر ہندوستان میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کے لیے تحاریک شروع ہوگئیں، اسی دوران ۳۰ صفطر المظفر ۱۳۳۸ھ/ ۲۴رنومبر ۱۹۱۹ء میں ''جمعیۃ علمائے ہند'' کا قیام عمل میں آیا جس میں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے علماء اور عوام شریک تھے، ۱۸ر ربیع الاوّل ۱۳۳۹ھ/ ۳۰رنومبر ۱۹۲۰ء کو حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہوگیا۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا بیان شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنیؒ حضرت مولانا محمد جلیل صاحب کیرانویؒ کی روایت سے نقل فرماتے ہیں : ''حضرتؒ نے تھوڑی دیر آنکھ کھول کر چھت کی طرف دیکھا پھر فرمایا کہ مرنے کا کچھ افسوس نہیں ہے مگر افسوس ہے کہ میں بستر پر مر رہا ہوں تمنا تو یہ تھی کہ میں میدانِ جہاد میں ہوتا اور اعلائے کلمۃ الحق کے جرم میں میرے ٹکڑے کیے جاتے، اس کے بعد آواز سے اللہ اللہ سات مرتبہ کہا آٹھویں مرتبہ آواز بند ہوگئی دیکھا تو زبان تالو سے لگی ہوئی تھی۔'' (نقشِ حیات ج:۲،ص:۴۹۱)

جمعیۃ علماء ہند اپنے دستور کے مطابق ننانوے فیصد کامیاب رہی، یہ الگ بات ہے کہ مخالفین نے ان کے کاموں اور مشن میں سدراہ بننے کی ہر ممکن کوشش کی اور بعض جگہ وہ کامیاب بھی ہوئے لیکن مجموعی طور پر جمعیۃ علماء ہند نے اپنے دستور کے مطابق پورے اخلاص اور صدقِ نیت کے ساتھ کام کیا۔ دستور کی مندرجہ بالا شقوں کی تشریح اور تفصیل دیکھنے کے شائق حضرات ''جمعیۃ العلماء کیا ہے'' (مؤلفہ حضرت مولانا سیّد محمد میاں صاحبؒ) کا مطالعہ کریں۔

جمعیت علماء ہند کے ایک نمایاں عالمِ دین حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بھی تھے جنہیں ۱۹۴۰ء کے بعد جمعیت علماء ہند کے بعض نظریات سے اختلاف ہونا شروع ہو گیا تھا، بعض لوگوں نے مسلم لیگ کے ایماء پر ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹ر اکتوبر ۱۹۴۵ء کو محمد علی پارک کلکتہ میں بعض علماء کا اجتماع بلایا اور حضرت علامہ عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کو اُن کی غیر موجودگی میں وہاں قائم ہونے والی نئی جماعت ''جمعیت علماء اسلام'' کا صدر منتخب کرلیا، حضرت علامہ عثمانیؒ نے اپنے اُستاد حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت سے عملاً علیحدگی اختیار فرمالی، جمعیت علماء اسلام نے بابائے قوم محمد علی جناح اور اُن کی جماعت مسلم لیگ کی رُوح اور منشا کے مطابق مکمل آزادی کے نصب العین کو چھوڑ کر تقسیم ملک کی تحریک شروع کر دی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ مسلم لیگ کو جمعیت علماء اسلام کی وجہ سے کامیابی عطا ہوئی۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو تقسیم ملک کے ساتھ قیام پاکستان عمل میں آیا یہ ایک حقیقت ہے اسے جھٹلایا نہیں جا سکتا، اس جغرافیائی تبدیلی کے بعد جمعیت علماء ہند کے بزرگوں نے اپنے فرائض کو نہایت (بقیہ ص:۱۵)